پنجرے کا آدمی

(افسانے)

رتن سنگھ

www.taemeernews.com

پنجرے کا آدمی

چالیس مختصر افسانے

رتن سنگھ

اُتر پردیش اردو اکاڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی

قیمت :- دس روپے

کتابت :- محمد احمد لکھنوی

طابع :- نامی پریس لکھنؤ

سنہ اشاعت :- دسمبر ۱۹۷۳ء

ملنے کا پتہ :- دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ

مصنف کا پتہ :- فلیٹ نمبر ایس ۶/۳

چندر نگر مارکیٹ، لکھنؤ

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

www.taemeernews.com

افسانوں کے نام

نئی کہانی	۵
میری کہانی	۶
پنجرے کا آدمی	۱۱
ناف کا درد	۱۷
منکر	۲۱
چہرے کی تلاش	۲۵
بابو	۳۱
زندگی سے دور	۳۶
ایک عام آدمی	۴۱
سمندر کی پیاس	۴۵
دوڑتی دھوپ	۴۸
آخری اداس آدمی	۵۲
واپسی	۵۵
بلو ماسٹر	۵۸
نقلی اور اصلی	۶۷
خدا نہیں آتا	۷۲
بدبو	۷۶
صرف ایک آدمی کا درد	۷۹
دشمن تو پہچانو	۸۴

www.taemeernews.com

مہرباں کیسے کیسے	۸۸
ایک منی بغاوت	۹۲
تین لڑکیاں	۱۰۲
ایک غریب دیگ	۱۰۸
اپنے جیسا	۱۱۳
تیسری فتح	۱۱۸
ڈھول	۱۲۴
اپنا شہر	۱۲۸
خدا کا دوست	۱۳۴
امداد	۱۴۰
روح کا درد	۱۴۵
آٹھواں پتھر	۱۵۲
پرچھائیاں	۱۵۷
لافانی نانک	۱۶۲
ایک پرانی کہانی	۱۶۸
الف سے آم	۱۷۱
پیغام	۱۷۸
لیمر	۱۸۲
پرانی مٹی	۱۸۶
سورج کا مہمان	۱۹۳
میلی گٹھڑی کا بوجھ	۲۰۲

www.taemeernews.com

نئی کہانی

میرے بھوکے اور ننگے کرداروں نے تمھارے باغ میں
کھلے پھولوں میں اپنے چہروں کے کھوئے ہوئے رنگ پہچان
لئے ہیں۔
ہلکورے کھاتی ہوئی یہ سمندر کی لہریں چاند کے صرف ایک
اشارے کی منتظر ہیں
چند لمحوں بعد جب چاند پورے شباب پر آیا تو میں
ایک نئی کہانی لکھوں گا۔
اب کی سمندر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر لہر کی جھولی کو
ہیرے موتیوں سے بھر دے گا۔
میرے بھوکے اور ننگے کرداروں کے چہروں پر زندگی
چمک اٹھے گی۔ اُن کے سروں پر ہیروں کے تاج ہوں گے

رتن سنگھ

www.taemeernews.com

میری کہانی

میری زندگی کی کہانی کا آغاز میں سمجھتا ہوں، میری پیدائش سے نہیں بلکہ کرہ ارض پر زندگی کے نمودار ہونے کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے سے شروع ہوتا ہے، اور اسی طرح اس کا اختتام بھی میری موت کے ساتھ نہیں ہوگا بلکہ جب تک اس کرۂ ارض پر زندگی کا وجود قائم ہے تب تک میری زندگی کی کہانی اس کی خاک کے ذروں میں چھپی رہے گی۔ اس کی فضاؤں میں گونجتی رہے گی اور اس کے پانیوں کی لہروں پر تیرتی رہے گی۔

یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے اکثر ایسا محسوس کیا ہے کہ میں زندگی کے وجود میں آنے سے پہلے جب ہر سمت پانی ہی پانی تھا یا لاوا ہی لاوا تھا۔ اس کی سطح پر پانی یا لاوے کا حصہ بنا تیرتا رہا۔ لہر بن کر اٹھکیلیاں کرتا رہا۔ دوسری لہروں سے ٹکراتا رہا۔ بلبلہ بن کر پانی کی سطح پر تیرتا رہا۔ قطرہ قطرہ ہو کر اچھلا، سورج کی شعاؤں سے چمکا اور

www.taemeernews.com

رات کے اندھیروں میں سمتوں سے بے نیاز صدیوں تک بھٹکتا رہا۔ یا پھر اکثر میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ چھوٹے سے ذرے کی شکل میں تیز و تند ہواؤں کے دوش پر سوار نامعلوم کن سمتوں میں ہزاروں برس تک ڈولتا رہا۔

اور پھر جب یہ لاوا اوپر سے سخت ہوا تو کہیں مٹی کے ڈھیر میں دبا رہا بے حس و بے جان۔ پھر کہیں دھوپ کی گرمی سے زمین چٹخی تو میں پھر سطح زمین پر نمودار ہوا۔ ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر کسی مٹی کے ڈھیر پر جا کر جم گیا۔ موسلا دھار بارش ہوئی تو ایک جگہ سے بہتا ہوا میلوں دور دوسری جگہ پہنچا کسی دوسرے مٹی کے ڈھیر پر۔ پھر وہاں پڑے پڑے ایک روز زمین کی کوکھ سے میں گھاس کا ننھا سا تنکا بن کر پھوٹ پڑا تو جیسے ساری کائنات میرے ننھے سے وجود سے ہری ہو گئی۔

میرا یہ ننھا سا وجود ایک عجوبہ تھا کہ بادلوں نے مجھے دیکھ کر خوشی کے مارے سات رنگی قوس قزح بنا ڈالی۔ ہوا میرے دوش سے ٹکراتے ہی مہک اٹھی، آسمان مجھے دیکھنے کے لئے افق پر اس طرح جھکا کہ جھکے کا جھکا ہی رہ گیا اور سورج نے خوش ہو کر شعاعوں کے ہاتھ میرے لئے نرم اور گرم دھوپ کا تحفہ بھیجا اور زمین پر مٹی کے ذروں میں جیسے جان پڑ گئی اور وہ مجھے دیکھنے کے لئے حرکت میں آ گئے اور رینگتے ہوئے میرے پاس پہنچے اور پھر وہ کیڑے مکوڑے جب پانی میں مچھلیاں بن کر تیرنے لگے، زمین پر سانپ بن کر رینگنے لگے تو اس بیچ میرا وجود بھی

www.taemeernews.com

بکھرتا ہوا ساری زمین پر چھا گیا۔

مختصر یہ کہ میں پودا بن کر لہرایا بھی ہوں مینڈک بن کر ٹرایا بھی ہوں سانپ بن کر کنڈلی مار کر بھی بیٹھا ہوں۔ مچھلیوں کی طرح تیرا بھی ہوں اور پرندوں کی طرح فضاؤں میں پرواز بھی کی ہے۔ غرضیکہ انسان کے جامے تک پہنچنے سے پہلے وہ کونسا روپ ہے جو میں نے دھارن نہیں کیا، یہاں تک تو خیر بات کچھ آسان تھی۔ لیکن انسان بننے کے بعد تو جیسے میری کہانی کو آنکھیں مل گئیں۔ وہ چاروں دیکھنے لگیں پھر میری کہانی کو کان مل گئے وہ کائنات کی ہر آواز کو غور سے سننے لگے۔ اسی طرح ناک مل گئی تو وہ زندگی کی ہر حقیقت کو سونگھنے لگی۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مجھے عقل مل گئی۔ عقل جس نے آنکھوں کے دیکھے کو اور کانوں کے سنے کو اور ناک کے سونگھے کو معنی پہنانے شروع کئے تو جیسے ساری کائنات، کائنات کی ہر حقیقت معنی خیز ہونے لگی۔ اور ان معنی خیز باتوں کی تہہ تک پہنچنے کے لئے میں آج تک حیران و پریشان ہو رہا ہوں۔

اس کوشش میں پہاڑوں کی گپھاؤں کے اندر میرا دم گھٹتا رہا۔ ان پہاڑوں کی چٹانوں سے ٹکرا کر میرا وجود اکثر پاش پاش ہوا اور میرا خون بہتے ہوئے پانیوں سے مل کر اپنا رنگ کھو بیٹھا ہے۔ میں نے اکثر تصور میں اپنے آپ کو گھنے جنگل میں دوسرے جانوروں سے ڈر کر کسی اونچے تنے پر سہما ہوا بیٹھا پایا ہے اور کبھی شیر جیسے خونخوار جانور سے ہاتھا پائی بھی کی ہے۔ میرے لئے یہ لمحے بڑے صبر آزما ہوتے ہیں۔ اکثر سوچتا ہوں اس تنے

www.taemeernews.com

ے کہیں نیچے نہ گر پڑوں یا اس شہر کے جنگل سے بچ بھی سکوں گا یا نہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ موت کی ان وادیوں سے باہر نکلتے ہوئے مجھے احساس نہیں ہوتا کہ موت کے یہ سائے کس طرح میرا پیچھا کرتے کرتے میرے اس جنم تک پہنچ گئے اور اب بھی قدم قدم پر مجھے ان کے ساتھ جوجھنا ہوتا ہے ۔

ہزاروں سالوں کے وقت کی طویل پگڈنڈی پر میں نے اپنے آپ کو ہر موڑ ہر مقام پر پایا ہے ۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میں جنگلوں کی خارزار راہوں سے لہو لہان گزر رہا ہوں ۔ پہاڑوں کی گھاٹیوں میں بھوکا پیاسا تپسیا کر رہا ہوں ۔ کہیں الہام سن رہا ہوں کہیں پیغام دے رہا ہوں ۔ کہیں قتل ہو رہا ہوں ۔ کہیں زہر پی رہا ہوں ۔ قتل ہونے سے پہلے جب تلوار میرے سر پر جھکنے لگتی ہے ۔ جب زہر میری رگوں میں تحلیل ہونے لگتا ہے اور جان ٹوٹنے لگتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں سال میں پیدا ہونے والے کروڑوں انسانوں کی زندگی کا مجموعی درد میرے وجود پر چھا جاتا ہے ۔ میرے اندر سمو جاتا ہے اور میری روح کی درد بھری آواز سنائی دیتی ہے ۔ ساری کائنات کو انسانی درد کی کہانی سنانے لگتی ہے ۔

اس طرح وقت کے آغاز کے ساتھ یہ کہانی شروع ہوئی تھی اور وقت چونکہ کبھی نہ ختم ہونے والے وقفے کا نام ہے ۔ اس لئے یہ ہمیشہ زندہ رہے گی ۔

www.taemeernews.com

میری زندگی کا یہ مختصر سا وقفہ جس میں قدرت نے مجھے یہ موقعہ عطا کیا ہے کہ اپنی کہانی کو کسی حد تک خود جی سکوں اور اسے تھوڑا بہت محسوس کر سکوں تو یہ وقفہ وقت کے ماضی اور مستقبل کے درمیان اتنی چھوٹی سی کڑی ہے کہ اس کا ذکر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر سے پانی کی ایک بوند کے ذکر کے مترادف ہوگا۔ جس سے سمندر کی وسعت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لئے اس کا ذکر چھوڑ کر وقت کی اس وادی میں داخل ہوتا ہوں جب میں دوبارہ خاک میں مل چکا ہوں گا

میں نے اکثر تصور کیا ہے کہ تب میں زندگی کی حسینہ کی آنکھوں میں کاجل بن کر لہراؤں گا۔ اس کے ماتھے پر بندیا بن کر چمکوں گا۔ اس کے ہونٹوں پر لالی بن کر مسکراؤں گا اور جب یہ نازنیں دھرتی کے باغ کی سیر کو آئے گی تو اس کے نازک تلوؤں کے تلے شبنم بن کر ٹوٹوں گا۔ گھاس بن کر اس کے قدموں کے تلے مخمل بچھاؤں گا اور پھولوں کی مہک بن کر جب اس کے گرم سانسوں کو مہکاؤں گا تو اس لمحے میں بھی زندہ ہو جاؤں گا۔

(دیباچہ)

www.taemeernews.com

پنجرے کا آدمی

وہ پتھر کی نوکیلی سل پر یوں بیٹھا تھا، جیسے اپنے اردگرد پھیلی کانٹے دار جھاڑیوں کی طرح وہاں پر اُگ آیا ہو۔ اس کے عین سامنے بجلی کے تاروں کا کھمبا گڑا تھا جس پر ہوتے ہوئے دور تا رحد نظر تک نظر آ رہے تھے۔ کھمبے پر سے گزرتے ہوئے تاروں پر دو پرندے بیٹھے تھے۔ اوپر والے تار پر بیٹھے پرندے کا رنگ سفید تھا اور نیچے والے تار کے پرندے کا ہرا۔

ابھی وہ ان پرندوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کی نظروں کے سامنے ایک پہاڑ گیند کی طرح اچھلنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پہاڑ اس بچے کی طرح اچھل کود رہا ہو جو سر کے بل قلابازیاں کھا کر خوش ہو رہا تھا ابھی وہ اس پہاڑ کو اپنی جگہ پر کودتے پھاندتے دیکھ کر ہی خوش ہو رہا تھا کہ اس پہاڑ نے چلنا شروع کر دیا۔ پھر تو ایک کے بعد دوسرے آسمان کی چوٹی کو چھونے والے پہاڑ اس کی نظروں کے سامنے کودتے پھاندتے ناچتے ہوئے گزرنے لگے جیسے ہی وہ پہاڑ جھومتے ان کی چوٹیوں پر اُگے

www.taemeernews.com

لمبے لمبے درخت ان کی کوکھ میں بسے ہوئے چھوٹے چھوٹے گاؤں اور چھوٹے چھوٹے کھیت یوں جھوم جاتے جیسے کوئی دوشیزہ اپنی جوانی کے بوجھ سے دُہری ہو رہی ہو۔ اور پھر پہاڑوں کے جھکتے ہی لاکھوں من پانی اور برف یوں نیچے کی طرف گر جاتی جیسے کوئی ڈاکو چاندی کے سکوں سے بھرا ہوا بوجھ زمین پر بے پرواہی سے ڈھیر کر دے۔

پتھر کی جس سل پر بیٹھا وہ یہ نظارہ کر رہا تھا اس کی تیکھی نوکیں اس کے جسم میں گڑی جا رہی تھیں اور ارد گرد پھیلی ہوئی کانٹے دار جھاڑیوں نے اس کے جسم کو جکڑ سا رکھا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس جسمانی تکلیف سے بچنا ممکن نہیں۔ اس لئے جسمانی درد سے بالکل بے نیاز وہ سامنے کا نظارہ دیکھنے میں محو تھا، جہاں ایک بڑے پہاڑ نے تیزی سے بھاگتی ہوئی ایک چھوٹی سی پہاڑی کو یوں اپنے ہاتھ میں اٹھا لیا تھا جیسے سڑک پر باپ اپنے بچے کو گود میں اٹھا لے۔

جب اس طرح ناچتے ہوئے پہاڑ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئے تو اس نے کھمبوں پر بیٹھے ہوئے دونوں پرندوں کو دیکھا پہلے سفید رنگ والا پرندہ اوپر کے تار پر بیٹھا تھا پھر سفید رنگ والے پرندے نے اپنی جگہ سے اڑ کر نیچے کے تار پر ہرے پرندے کی جگہ لے لی۔

اب اس کے سامنے ایک پتلی سی ندی آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑی ہونے لگی۔ پھر اس نے تیز تیز دوڑنا شروع کر دیا۔ ندی کے ساتھ ہی ساتھ اس کے کنارے اُگے ہوئے پیڑ پودے اور بسے ہوئے گاؤں قصبے اور شہر بھی دوڑنے لگے

www.taemeernews.com

گاؤں کے بعد شہر اور شہروں کے بعد گاؤں اس کی نظر کے سامنے سے گزرتے رہے۔ پھر کچھ جانا پہچانا سا ماحول سامنے آیا۔ ایک چراگاہ جس کے بیچ میں ایک آم کا پیڑ تھا۔ اس کے سامنے سے بڑی آہستگی سے گزری۔ پھر اس کچے راستے کی رفتار اور کم ہو گئی جس کے کنارے وہ چراگاہ تھی۔ وہ جب تھوڑا اور آگے بڑھا تو ایک کنواں آیا۔ جو چاروں طرف سے پیڑوں سے گھرا ہوا تھا اس نے پہچان لیا یہ اس کا اپنا کنواں تھا۔ جہاں وہ بچپن میں روز صبح شام نہایا کرتا تھا اس نے چاہا کہ چیزوں کے چلنے کی رفتار رک جائے لیکن کہاں؟ قبل اس کے کہ وہ اپنے کنوئیں پر آگے بڑھے اس آم کے پیڑ کو دیکھ سکے جس کی شاخ پر وہ بچپن میں قریب قریب لیٹ سا جایا کرتا تھا۔ کنواں پیچھے رہ گیا تھا۔ اور اب اس کے سامنے سے اس کا گاؤں گزر رہا تھا۔ پھر اسکا گھر آیا۔ جہاں کبھی اس نے اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں گھر کو دیکھ کر خود بخود اس نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی تاکہ بھاگ کر اپنے گھر جا سکے لیکن بھاگنا تو درکنار اس کے لئے تو اپنی جگہ سے ہلنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس لئے جھاڑیوں سے کتنے ہی کانٹے اس کے جسم میں یوں چبھ گئے جیسے کہہ رہے ہوں" ہم سے بھاگ کر کہاں جا سکو گے"۔ اس کا جسم درد کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ اس نے آنکھوں میں درد بھر کر سامنے دیکھا جیسے کسی کی مدد حاصل کرنا چاہتا ہو لیکن وہاں تو پانچ اجنبی اپنی بندوقوں کا رخ اس طرف کئے ہوئے تھے جیسے کہہ رہے ہوں "خبردار اپنے گھر کی طرف آنے کی کوشش کی۔ اس لکیر کے پار آنا منع ہے۔

www.taemeernews.com

اس کا گاؤں اس کی نظروں کے سامنے سے کب کا گزر چکا تھا۔ لیکن وہ اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اسے گھر جانے سے کیوں منع کیا گیا۔ بچپن میں اس نے دیکھا تھا کہ دن ڈھلے گائے بھینسیں چراگاہ سے واپس آکر سیدھے اپنے اپنے گھر جاتی تھیں۔ کیا وہ ان گائے بھینسوں سے بھی گیا گزرا ہے۔

جب اپنے خیالوں سے چونک کر اس نے سامنے دیکھا تو اس کے سامنے سے کئی آدمی، عورتیں، بچے بوڑھے گزر رہے تھے لیکن اس بار پریشانی یہ تھی کہ جن لوگوں کے لئے وہ چاہتا تھا کہ وہ چلتے چلتے ذرا اس کے پاس رکیں۔ اس سے دو باتیں کریں وہ تو تیزی سے اس کی طرف دیکھے بغیر یا اس کی پرواہ کیے بغیر آگے نکل جاتے۔ اور جن لوگوں کو وہ نہیں چاہتا تھا۔ ان کو اس سے جیسے کوئی خاص دل چسپی تھی۔ وہ اس کے پاس کتنی کتنی دیر رکے رہے اور بے کار سے سوال پوچھتے رہتے۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

اس نے جھنجھلا کر جواب دیا "جہنم کا، تم سے مطلب؟"

"یہاں کب تک یونہی بیٹھے رہو گے؟"

"جب تک دم میں دم ہے تب تک تو بیٹھنا ہی ہوگا۔"

"یہ تاروں پر بیٹھے ہوئے پرندے کیا تمہارے پالتو ہیں۔ اگر پالتو نہ ہوں تو ہم لے لیں"؟

اس کی آنکھیں غصہ سے لال ہوگئیں "میں تو اپنی جگہ سے ہل نہیں پا رہا ان پرندوں کو تو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنی جگہیں بدلتے ہوئے

www.taemeernews.com

دیکھنے دو۔"

پھر اس نے غصہ میں آکر سامنے دیکھنا ہی بند کر دیا۔ اور جہاں تک اس کی نظر جا سکتی تھی اس نے پیچھے کی طرف جھانک کر دیکھا ایک شہر کو آگ لگی تھی۔ لوگ چیخ پکار کر رہے تھے۔ مدد کے لئے فریاد کر رہے تھے وہ اپنی جگہ سے ہل تو نہیں سکتا تھا لیکن لوگوں کی چیخ پکار سن کر وہ چلایا۔ "ارے اس شہر کو جلنے سے بچاؤ۔" اس کے چلاتے ہی کوئی زور سے ہنسا۔

کیسا پگلا ہے جو شہر ہزاروں سال پہلے جل چکا۔ یہ اس کی آگ بجھانے کے لئے آج پکار رہا ہے۔"

وہ سمجھ نہیں پایا کہ اس آدمی نے ایسا کیوں کہا کیوں کہ اب اس کی نظر ایک صلیب پر ٹکی تھی۔ جس پر کسی نورانی چہرے کو لٹکا کر کچھ لوگ خوش ہو رہے تھے۔ وہ پھر بے بس ہو کر چلایا۔ لوگو! اس آدمی کو ان درندوں سے بچاؤ۔" اب پھر کوئی زور سے ہنسا۔ "یہ کون ہے جو ہزاروں سال قبل صلیب پر لٹکے آدمی کو بچانا چاہتا ہے۔ بھلا اب تک وہ زندہ بچا ہوگا۔

اب کی وہ پریشان ہو گیا کہ لوگ اس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں اس نے اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے لوگوں کی پرواہ نہ کر کے ان سے پیچھے دیکھنا چاہا۔ جہاں کچھ آدمی بھوک سے بلک رہے تھے وہ ان کی پریشانی برداشت نہ کر سکا اور چلایا۔ ارے ان بھوکے لوگوں کو مرنے سے بچاؤ۔ انھیں کچھ کھانے کو دو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک ساتھ کتنے ہی کانٹے اس کے جسم میں اور مضبوطی سے گڑ گئے۔ جب وہ درد سے نڈھال

www.taemeernews.com

ہو رہا تھا تو اس کے کانوں میں کسی کی ہنسی کی آواز پڑی کیسا پگلا ہے جو آدمی ہزاروں سال بعد پیدا ہوں گے ہم آج ان کو بھوکا مرنے سے کیسے بچا سکتے ہیں "

یہ سنتے ہی اس کا دماغ چکرا گیا اور مارے درد کے بے ہوش ہوتے ہوئے اس نے اپنا سر پتھر کی نوک پر یوں ٹکا دیا جیسے ابدی نیند سونے کی تیاری کر رہا ہو۔

اب وہاں جھاڑیاں ہیں۔ پتھر ہیں۔ اور کچھ نہیں جیسے ان جھاڑیوں اور پتھروں کے کانٹوں اور نوکوں نے اسے نگل لیا ہو۔ اسے وہاں نہ پا کر تاروں پر بیٹھے ہوئے پرندے حیرانی سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ وہ آدمی کہاں گیا۔ جو ان جھاڑیوں میں پھنسا بیٹھا تھا۔

www.taemeernews.com

ناف کا درد

جب بھی کبھی کوئی رشتہ ٹوٹتا ہے تو میری ناف میں درد ہوتا ہے۔
یہ درد مجھے پیدا ہوتے ہی ملا تھا۔ جب ناف کاٹ کر مجھے ماں سے الگ کیا گیا تھا تو مجھے ایسا لگا جیسے ماں سے میرا رشتہ کٹ گیا ہے۔ تب مجھے بہت درد ہوا تھا۔

پھر یہ ناف کا درد اس وقت ہوا جب عیشاں سے میرا رشتہ ٹوٹا عیشاں لوہاروں کی لڑکی تھی۔ میری ہم عمر۔ اس سے رشتہ جڑا یوں کہ وہ لوگ ہماری اس حویلی کے ایک حصے میں رہا کرتے تھے جہاں ہماری گائے باندھی جاتی تھی۔ اس لئے وہاں دن میں دو چار مرتبہ آنا جانا پڑتا تھا۔

میری دادی کہتی تھی "جا۔ عیشاں کو ساتھ لے کر گائے کو پانی دکھا آ" یا پھر عیشاں کو ساتھ لے کر گائے کو پچھلی کوٹھری سے کھول لا۔ یا باندھ آ۔

www.taemeernews.com

مجھے عشاؔ کے ساتھ اندھیری کوٹھری میں چند لمحے گزارنا بڑا پسند تھا۔ اندھیرے میں ایک دوسرے کی قربت کا احساس گائے کے تازہ دودھ کی دھاروں کا سا مزا دے جاتا، جو گائے کے تھنوں سے سیدھا میری دادی میرے منھ میں مارا کرتی تھی۔ اس قربت میں گرمی بھی ہوتی اور مٹھاس بھی۔

لیکن ایک دن میرے اور عشاؔ کے درمیان آگ اور خون کا دریا حائل ہو گیا۔ اور ہم ایک دوسرے سے کبھی نہ ملنے کے لئے بچھڑ گئے اور میری ناف میں شدید درد ہوا۔ یہ درد ماں سے رشتہ کٹنے سے بھی زیادہ لطیف تھا۔ ماں سے رشتہ خود بخود بن گیا تھا۔ لیکن یہ رشتہ تو میں نے خود اپنے ہوش اور شعور کے ساتھ جوڑا تھا۔ اور اپنے ہاتھوں لگایا ہوا پیڑ جب کاٹ دیا جائے تو درد میں زیادہ شدت ہوتی ہے۔

اب بھی کبھی کبھی عشاؔ میرے تصور میں آتی ہے اور کہتی ہے۔ میں تمہارے پاس ہوں۔ میں کہتا ہوں۔ ہاں ہم ایک دوسرے کے پاس اندھیری کوٹھری میں کھڑے ہیں۔ آؤ زندگی کی گائے کو کھول کر باہر کھلے آنگن میں لے چلیں۔ لیکن ہم دونوں کو گائے تو کیا، گائے کی گھنٹی بھی دکھائی نہیں دیتی اور پھر میری ناف میں درد ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح میں بھی کبھی کبھی فضاؤں کو چیرتا ہوا خون اور دریا کے اُس پار جاتا ہوں تو لوٹ کر آتے ہوئے ناف کا درد اور سوا ہو جاتا ہے۔

اب ہر جگہ رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔

www.taemeernews.com

پیدل چلتا ہوا میرا ہر قدم زمین کے ساتھ رشتہ جوڑنے کی سعی کرتا ہے لیکن فوراً ہی رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور جواب میں ملتی ہے گرد..... درد..... گرد۔ جو میری شکل کو بدشکل بنا دیتی ہے۔ اور درد جو ناف سے اٹھتا ہے تو پھر سارے وجود پر چھا جاتا ہے۔

میرا پڑوسی پندرہ سال سے مجھے جانتا ہے۔ لیکن روز مجھے پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

میرا دوست تین مہینے سے ہسپتال میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور مجھے پتہ نہیں چل پاتا۔ ناف میں درد ہونے لگتا ہے۔

اور تو اور سگے بھائیوں سے برسوں بعد یوں ملاقات ہوتی ہے جیسے غیر مل رہے ہوں۔ رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اگر نہ ملتے تو اچھا ہوتا۔ ناف کا درد سوا ہونے لگتا ہے۔

زندگی اتنی الجھ کر رہ گئی ہے کہ صبح گھر سے نکلتے ہی بیوی بچوں سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ دفتر سے باہر نکلو تو دفتر سے ناطہ ختم۔ یہی حال کالونی ہاؤس، بازار، دوست، احباب اور رشتے داروں کا ہے۔ ہر جگہ سے الگ ہوتے ہی رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور ہر دفعہ ناف کا درد جاگ اٹھتا ہے۔

اسی طرح میں ایک روز اس ناف کے درد سے تڑپ رہا تھا کہ مجھ سے میرے دل نے کہا۔ تم ناف کے درد سے تڑپا نہ کرو۔ اس زمین پر رشتوں کا ٹوٹنا لازمی ہے۔ دیکھتے نہیں۔ چاند کا اس زمین سے رشتہ ٹوٹے

www.taemeernews.com

کروڑوں سال ہوگئے۔ تب سے چاند اس کا طواف کرتے کرتے تھک گیا۔ لیکن یہ ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ نہیں پاتا۔

تھوڑی دیر رک کر غالباً میرے درد کو محسوس کرتے ہوئے وہ بولا۔ "اس دنیا میں ہر آدمی کی ناف کٹی ہو۔ ہر آدمی زندگی سے کٹا ہے اور ہر آدمی کے ناف کا درد ہوتا ہو۔ یہ الگ بات ہو کہ اُسے اس کا احساس نہ ہونے پائے۔"

میں نے کہا: "جس آدمی کے درد ہوتا ہو۔ اُسے دوسروں کے درد کا احساس ہوتا ہو۔ اگر اس دنیا میں سب کی ناف کٹی ہو تو سب ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔"

اس نے کہا: ہاں! اگر ہر آدمی کو اپنے اس ناف کے درد کا احساس ہو جائے تو اسے سب کے درد کا احساس ہو جائے۔ اور پھر تم کو تمھاری بیتاں مل جائے۔ اور ہر ایک اپنی عشاءت کے ساتھ زندگی کی گائے کو اندھیری کوٹھری سے نکال کر کھلے آنگن میں لے آئے تو اسے گرم اور شیریں دودھ پینے کو ملے۔

اور اب میں ہر ایک سے پوچھتا ہوں۔ سوال کرتا ہوں: کیا تمھاری ناف میں درد ہوتا ہے"؟

جب وہ میرے سوال کو سن کر ہنسنے لگتا ہو تو میری ناف کا درد اور بڑھ جاتا ہو۔ اور بڑھ جاتا ہو۔

www.taemeernews.com

مُنکر

میری کہانی بہت ہی پر درد ہے صاحب۔ لیکن یہاں تو بہت شور ہے
موٹریں، ٹرک، گاڑیاں، آجا رہی ہیں۔
اور یہ بوڑھا فقیر الگ اللہ کے نام کی رٹ لگائے ہے۔
آؤ۔ وہاں اس برگد کے نیچے آجاؤ۔
یہ برگد کا پیڑ بھی میری طرح بوڑھا ہے۔ صدیوں پرانا۔ جس طرح
اس کے کتنے ہی تنے ہیں۔ بہت سی شاخیں ہیں اور ان گنت پتے ہیں
اس طرح میری زندگی کی بھی بہت سی شاخیں ہیں۔
اب میں کہاں سے اپنی کہانی شروع کروں۔
اچھا! تو لو۔ شروع سے ہی بتاتا ہوں۔ لیکن بھئی واقعات کو میں
ان کے تسلسل کے ساتھ بیان کر پاؤں۔ یہ شاید ممکن نہ ہو۔
مجھے اتنا یاد ہے کہ میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی میرے مارنے کے
منصوبے بن چکے تھے۔ میری ماں کو انھوں نے ایک بند کمرے میں قید کر رکھا تھا

www.taemeernews.com

کہ جیسے ہی میری پیدائش ہو، اُسی وقت مار دیا جاؤں۔ لیکن جس کو رکھے سائیاں اس کو مارے کون کے مصداق میں بچ گیا۔ اور راتوں رات کوئی مجھے ایک معمولی ٹوکری میں ڈال کر دریا کے اس پار کسی گاؤں میں لے گیا۔ جہاں میرے مارنے والوں کی پہنچ نہیں تھی۔

بچپن کی کوئی بات یاد نہیں۔ صرف اتنا پتہ ہے کہ میں گاؤں کے لڑکوں، بالوں کے ساتھ گائیں چرانے کے لئے جنگل میں جایا کرتا تھا یا پھر دریا کے کنارے یا پنگھٹوں پر گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ خوب کھیلا کرتا تھا۔

چونکہ پیدا ہوتے ہی موت نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اس لئے بچپن کی ان بے فکریوں کے باوجود میرے تصور میں موت کا سایہ ہر وقت میرے گرد منڈلاتا رہا۔ ہر لمحے یہ احساس رہا جیسے کالا ناگ میرے وجود کو ڈسنے کے لئے مجھے جھلس دینے کے لئے میرے ماتھے کے عین سامنے لہراتا ہوا پھنکاریں مار رہا ہے۔

موت کے اس ابدی سائے کی وجہ سے میرا رنگ سانولا پڑ گیا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور جینے کے لئے کوشاں رہا۔

لیکن شادی کے فوراً بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ میرے اپنے بھائی بندوں نے میری جائیداد چھین کر مجھے اپنی بستی سے باہر نکال دیا۔

میں نے خود ہی جائیداد سے دست بردار ہو جانے کے لئے

www.taemeernews.com

کہہ دیا۔ لیکن انھیں شاید میری سچائی پر یقین نہیں تھا۔ اس لئے مجھے مجبوراً نکلنا ہی پڑا۔ اس کے بعد میں متواتر چودہ سال تک دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ اس بیچ میری بیوی کو بھی کوئی اغوا کر کے لے گیا۔ لاکھ تگ و دو کے بعد بیوی واپس بھی ملی تو پھر وہ دونوں بچوں کے ساتھ کہیں مجھ سے بچھڑ گئی۔

زندگی کے انہی دکھوں اور غموں سے گھبرا کر آخر میں نے دنیا کو خیرباد کہا اور اسی طرح کے ایک برگد کے پیڑ کے نیچے جو ایک گھنے جنگل میں تھا۔ میں برسوں بھوکا پیاسا رہ کر تپسیا کرتا رہا۔

جنگل کے اس اندھیرے میں ایک دن ایک لطیف سی روشنی ہوئی تو میں اس روشنی کو ساتھ لے کر بستی بستی گھومنے لگا۔

انہی دنوں دو بہت بڑے بادشاہوں کے درمیان خونریز جنگ ہو رہی تھی۔ لوگ گاجر مولی کی طرح کٹ کر مر رہے تھے۔

میں نے اُن سے کہا۔ تم لوگوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ کسی بھی جاندار کو نہ مارو۔ کسی کو دکھ نہ دو۔

لیکن انھوں نے میری ایک نہ سنی۔ الٹا میں جہاں جاتا۔ وہیں لوگ پتھر لے کر مجھے مارنے دوڑتے۔

اس طرح مجھے مجبوراً ہجرت کر کے مکّے سے مدینے جانا پڑا۔

وہاں بھی لوگوں نے مجھے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ میں اپنی پریشانیوں کا بوجھ اٹھائے اسی طرح کسی شہر میں گھوم رہا تھا۔ کہ وہاں کے

www.taemeernews.com

لوگوں نے مجھے پکڑ لیا۔ اور یہ الزام لگا کر کہ میں ایک کنواری لڑکی کا بیٹا ہوں۔ مجھے انھوں نے سرِ بازار پھانسی پر لٹکا دیا۔

اب تم کہو گے کہ بوڑھے کا دماغ چل گیا ہے۔ اگر پھانسی پر ہی لٹکا دیا گیا تھا تو اس وقت زندہ کیسے ہوں؟

ہاں میاں! جس آدمی پر اتنی مصیبتیں نازل ہوئی ہوں، وہ پاگل نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔؟

لوگ کہتے ہیں دنیا میں اتنے پیغمبر آئے۔ انسانیت کی بہتری کے لئے۔ میں کہتا ہوں۔ سب جھوٹ ہے۔ ایک بھی نہیں آیا۔

اب دنیا چاہے مجھے منکر ہی سمجھ لے۔ زیادہ سے زیادہ مجھے ایک مرتبہ اور کوئی سزا دے گی۔ اور کیا کرے گی؟ میں سب سزائیں بھگت چکا ہوں۔ اب مجھے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا۔ اسی لئے ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں۔ اور پھر کہتا ہوں کہ اب تک دنیا میں ایک بھی پیغمبر نہیں آیا۔ اگر آیا ہوتا تو کیا یہ بوڑھا فقیر ازل سے اسی طرح بھیک مانگ رہا ہوتا۔؟

ارے بھئی کوئی تو اس کا کاسہ بھرتا۔!

---

www.taemeernews.com

چہرے کی تلاش

میں نے اپنے تھکے ہوئے جسم کو گرم گرم چائے پلائی اور تھوڑی دیر کے لئے نرم و گرم بستر پر لٹا دیا جب تھکاوٹ اترنے لگی تو اسے گرم پانی سے نہلایا۔ نہلانے کے بعد جب اس کی بھوک پوری طرح چمک اٹھی تو اسے بہترین کھانا کھلایا۔ تھکاوٹ اور کھانے کے کیف سے جب اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں تو میں نے اسے سلا دیا۔ رات بھر اس نے کروٹ نہیں بدلی۔ صبح اس کی تمام تھکاوٹ دور ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں صرف رات کی نیند کا خمار تھا۔

صبح اٹھتے ہی میں نے اسے ایک مرتبہ پھر گرم گرم چائے پلائی تاکہ نیند کا خمار جاتا رہے۔ اس کے بعد گرم پانی سے نہلایا تو یہ ایک دم تازہ دم ہو گیا۔ ہلکا پھلکا۔ ایسا کہ ہوا میں اڑنے لگے۔ زمین پر چلتے ہوئے یہ قدم اٹھا نہیں رہا تھا۔ بلکہ خود بخود اٹھ رہے تھے ان ہی ہلکے پھلکے قدموں سے میں اسے غالیچہ نما گھاس پر چلاتا ہوا قریبی

www.taemeernews.com

باغ میں لے گیا۔ پھولوں کی مہک سے لدی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے اسے اور بھی آرام پہنچایا۔ پیڑوں پر چہچہاتے پرندوں کی لطیف آواز حد نظر تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے جھومتے پیڑ، اور ارد گرد رنگ برنگے قدرتی مناظر میں بہنچ کر اس نے یہ محسوس کیا جیسے یہ بھی قدرت کے اس حسین ترین گوشے کا ایک خوبصورت ترین پھول ہی۔ کوئی فرق ہی تو صرف یہ کہ اور پھول تو محض اپنی ڈالی کے ساتھ لگے ہی جھوم سکتے ہیں۔ اور وہ ہی کہ اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے جا سکتا ہی۔ جہاں چاہے گھوم سکتا ہی۔

اسی طرح ہواؤں کے دوش پر سوار کر کے میں اسے واپس اُس کے کمرے میں لے آیا۔ وہاں اسے ناشتہ کرایا۔ ابھی ناشتے کی چائے پی رہا تھا۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے اسے اس دستک کا پتہ نہیں چلنے دیا۔ اُس کے کپ میں تھوڑی چائے اور انڈیلی اور خود دروازے پر دیکھنے گیا کہ کون ہی؟

دروازے پر بہت سے دکھ کھڑے تھے۔ کچھ پریشانیاں کھڑی تھیں وہ کہنے لگے "ہم صاحب کے آج کے دکھ اور پریشانیاں ہیں ہمیں اندر جانے دو۔" میں نے کہا "آج صاحب آرام کر رہے ہیں چھٹی پر ہیں۔ تم لوگ جاؤ۔ کل آنا۔"

وہ کہنے لگے "ہمارا کام کل پر نہیں ٹالا جا سکتا۔ کل تو دوسرے دکھوں اور غموں کی باری ہو گی۔ ہمیں تو اپنا کام آج ہی کرنا ہے

www.taemeernews.com

یہ قدرتی اصول ہے۔"

میں نے کہا۔ جب آدمی بیمار ہوتا ہے تو اسے روزمرہ کے معمول سے چھٹی مل جاتی ہے۔ صاحب کل بہت تھکے ہوئے تھے۔ رات بھر آرام کرنے کے بعد اب وہ کچھ تازہ دم ہوئے ہیں۔ اس وقت میں تمہیں ان سے ملنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

اپنے جسم کے آج کے دکھوں اور غموں کو واپس بھیج کر کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا تو میرا جسم اطمینان سے چائے کا آخری پیالہ پی رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں نے کتنی بڑی پریشانی سے ابھی ابھی اسے نجات دلائی تھی۔

تبھی دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اب کی مرتبہ میرے جسم کے کچھ پرانے غم اور دکھ دروازے پر کھڑے تھے۔ وہ بولے ہمیں اندر جانے دو۔ ہمیں صاحب کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا ہے۔ ایک دکھ بولا۔ مجھے یاد کر کے صاحب کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھے گی۔ اور وہ بہت دیر تک بے چین رہیں گے دوسرا بولا اور میرے سامنے پڑتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگیں گے اور وہ بہت دیر تک نضا میں گھورتے رہیں گے جیسے وہ کسی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈنے کے لئے پریشان ہوں

میں نے کہا۔ آج آپ لوگوں کی صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔

www.taemeernews.com

وہ سب ان نہیں رہے تھے۔ بڑی خوشامد سے انھیں واپس لوٹا کر کمرے میں آیا تو میرا جسم ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ اور اطمینان سے چارپائی پر نیم دراز تھا۔

میں نے اسے بہترین لباس پہنایا اور پھر اس اندیشے سے کہ پھر کوئی اور پریشانی دروازے پر دستک نہ دے میں اپنے جسم کو گھر سے باہر لے آیا۔

اس پہاڑی سیرگاہ میں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں قہقہے ہی قہقہے تھے۔ مسرت ہی مسرت تھی۔ اور میرا جسم اُن سب خوشیوں کو پاکر پھولا نہیں سما رہا تھا۔

اس دن میں نے اپنے جسم کو بہت سی خوشیاں دیں۔ اسے خوبصورت لڑکیوں سے بات کرنے کا بہت شوق ہے۔ اس لئے میں اسے ایسی جگہ لے گیا۔ جہاں گھنٹوں ایک سے ایک خوبصورت لڑکی سے بات کی جا سکتی تھی۔ ایک لڑکی کے ساتھ تو اسے اکیلے میں بھی بات کرنے کا کافی موقعہ دیا۔ اس کے علاوہ جھیل میں ناؤ کی سیر کرائی۔ عمدہ من بھاتا کھانا کھلایا۔ نئی نئی جگہوں پر لے گیا۔ بڑے بڑے لوگوں سے ملایا۔ ہر جگہ اس کی عزت کرائی۔

اس ہنگامے میں میں نے اسے اتنی مہلت بھی دی کہ یہ ایک تصویر بنا سکے۔ پچھلے تجربے سے مجھے یہ معلوم ہے کہ جب تک

www.taemeernews.com

اس کی فن کارانہ صلاحیتوں کو اظہار نہیں ملتا، تب تک ساری دنیا کی خوشیاں مل جانے کے باوجود یہ... بہت کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ اس لئے اسے مکمل خوشی عطا کرنے کے لئے میں نے اسے یہ موقعہ بھی دیا۔ یہ کافی دیر تک رنگوں اور کینوس سے کھیلتا رہا اور جب ایک خوبصورت تصویر کینوس پر ابھر آئی تو اس کا چہرہ شاداب ہوا تھا۔

میں نے دیکھا کہ تصویر بناتے ہوئے جیسے جیسے کینوس پر لکیریں ابھر رہی تھیں اس کے چہرے پر پرانے دکھوں اور غموں نے جو انمٹ نقوش چھوڑے تھے، وہ آہستہ آہستہ مٹ رہے تھے اور جیسے جیسے وہ تصویر میں نئے رنگ بھر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نئے خوش نما رنگ بھر رہے تھے۔

یہاں تک کہ جب وہ تصویر کو مکمل کر چکا تو اس کا اپنا چہرہ بھی یکسر بدل گیا۔ فکروں، غموں اور دکھوں کی تمام لکیریں مٹ گئی تھیں۔ اور ان کی جگہ خوشیوں اور مسرتوں کی نئی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ ان لکیروں میں زندگی کا تازہ لہو دوڑ رہا تھا۔ اور آنکھوں میں نئے چڑھتے ہوئے سورج کی روشنی تھی۔

وہ چہرہ جس کا بوجھ وہ پچھلے چالیس سالوں سے اٹھائے گھوم رہا تھا۔ بالکل بدل گیا تھا۔

میں اس تبدیلی پر بے حد خوش تھا۔ اور چاہتا تھا کہ وہ بھی

www.taemeernews.com

اس تبدیلی کو دیکھ کر خوش ہو۔ اس لئے میں اسے ساتھ والے کمرے کی طرف لے کر چلا۔ جہاں قدم آدم آئینہ تھا۔ دل ہی دل میں میں سوچ رہا تھا کہ کل جب اس کے اپنے دکھ اور پریشانیاں اسے پہچان نہ پاکر مایوس لوٹ جائیں گی تو کتنا مزہ آئے گا۔؟
آئینے میں اپنے وجود کو دیکھتے ہی خوش ہونے کے بجائے اس کے چہرے کا رنگ اڑ سا گیا۔ آنکھیں غصے سے لال ہو گئیں اور وہ جلدی سے کمرہ کھول کر رات کے اندھیرے میں تیز تیز دوڑنے لگا۔ جہاں اسے اپنے اصلی چہرے کی تلاش تھی۔

www.taemeernews.com

بابو

ڈیم بڑی تیزی سے اُبھر رہا تھا۔

ہزاروں ہاتھ مصروف تھے۔ کوئی نقشے بنا رہا تھا۔ کوئی مٹی کاٹ رہا تھا۔ کوئی مٹی ڈھو رہا تھا۔ کوئی پتھر توڑ رہا تھا۔ کوئی لوہے کی سلاخوں سے لے کر گرانڈیل گرڈروں کو مناسب جگہوں پر رکھ رہا تھا۔ کوئی بڑی بڑی مشینوں اور کرینوں کی مدد سے ٹنوں وزنی چیزیں اِدھر سے اُدھر پھینک رہا تھا۔ اور اس سارے کام میں اتنا شور تھا کہ ساری وادی ہر وقت گونجتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ رات کے وقت جب بجلیوں اور گیسوں کی چمکتی روشنیوں میں کام کرنے والوں کے سائے لمبے لمبے ہو جاتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہاں آدمی نہیں بلکہ بڑے بڑے دیو کام کر رہے ہوں۔

ہاں! دیو ہی تو کام کر رہے تھے۔ تبھی تو مٹی کا ہاندھا اونچے پہاڑوں کے قدموں سے ابھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے سر اٹھا کر

www.taemeernews.com

پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں سے آنکھ ملا کر بات کرنے لگا۔
مٹی کے اُس باندھ کے ایک طرف پانی کی پتلی سی ندی سوکھ گئی تھی اور باندھ کے دوسری طرف اُسی ندی کا پانی جمع ہو کر ایک چھوٹے سے سمندر کی شکل اختیار کر رہا تھا۔
اور اس کی ساری وادی میں سڑکوں کا ایک جال سا بچھ گیا تھا جن پر موٹر گاڑیاں۔ ٹرک کرینیں، بل ڈوزر بھاگتے رہتے چنگھاڑتے رہتے۔
پہاڑوں کی ڈھلانوں پر وادیوں کی گود میں اور ڈیم کے اردگرد بڑی بڑی عمارتیں بھی بن گئی تھیں۔ جہاں بڑی بڑی مشینیں لگائی جا رہی تھیں۔ تاروں کے تانے بانے اور مشینیوں کی پیچیدگیوں کو دیکھ کر عقل حیران ہوتی تھی۔
وہ دماغ وہ ہاتھ اور پاؤں جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو تھوڑی دیر ستانے کے لیے اپنے عارضی گھروں میں چلے جاتے۔ وہاں تھوڑی دیر سوتے، چائے پیتے، کھانا کھاتے اور کپڑے بدل کر تازہ دم ہو کر پھر وہ ہوتے اور اُس ڈیم کا کام۔
اُن مصروف لوگوں کے بیچ کچھ روز سے ایک بوڑھا آنے لگا ہے۔ اس کے لاغر جسم پر صرف ایک دھوتی ہوتی ہے۔ ہاتھ میں سوٹی اور پاؤں سے ننگا۔ اس لیے اس کی شخصیت میں کوئی بھی چیز بظاہر جاذب نظر نہیں ہے۔ اور ممکن ہے اُن مصروف لوگوں کو اس

www.taemeernews.com

شخص کی آمد کا احساس بھی نہ ہوتا۔ لیکن چشمے کے پیچھے سے چمکتی ہوئی اُس کی ذہین آنکھوں سے کچھ ایسی روشنی پھوٹتی ہے جو مقناطیسی کشش کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

بوڑھا اُن لوگوں کے بیچ سے گزرتا ہوا اچانک کسی شخص کے پاس رک جاتا ہے اور پوچھتا ہے۔

"یہ ڈیم کب بن جائے گا؟"

"دو سال میں۔"

"پھر اِس ڈیم سے پیدا ہونے والی بجلی کلو کو ملے گی؟"

"کون کلو؟" کام کرنے والا آدمی پوچھتا ہے۔

"وہ دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہے۔"

"ہاں، یہ بجلی اردگرد کے سو میل کے رقبے والے سبھی لوگوں کو ملے گی۔"

"کلو کو بھی؟" بوڑھا پھر وہی نام دہراتا ہے۔"

کچھ دور آگے جا کر بوڑھا پھر رک جاتا ہے اور کسی سے پوچھتا ہے

"اس نہر سے جو پانی کی نہر نکل رہی ہے، وہ کلو کے کھیتوں کو پانی دے گی؟"

"ہاں! اس نہر سے چار ہزار مربع میل کھیتوں کو پانی ملے گا۔"

"کلو کے کھیتوں کو بھی؟" بوڑھا پھر اپنا شک مٹانا چاہتا ہے۔

اس کارندے کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ اس سے پوچھ سکے کہ کلو کے کھیت کہاں ہیں۔ اس لئے وہ اسے ٹالتے ہوئے جواب دیتا ہے۔

www.taemeernews.com

"ہاں کلو کے کھیتوں کو بھی پانی ملے گا۔"

"بوڑھا یہ جواب سن کر مطمئن سا آگے بڑھ جاتا ہے۔

اسی طرح وہ بوڑھا کچھ دن متواتر آتا رہا اور لوگوں سے اپنے وہی مخصوص سوال دہراتا رہا۔

"کیا کلو کے گھر تک اس ڈیم کی بجلی پہنچے گی؟"

"کیا کلو کے سوکھے کھیتوں کو اس ڈیم سے نکلنے والی نہر سیراب کرے گی؟"

پھر اچانک وہ بوڑھا کہیں غائب ہو گیا اور ڈیم پر کام کرنے والے وہ مصروف لوگ اُس بوڑھے کو یکسر بھول گئے۔

وہاں ڈیم اور اونچا ہوتا رہا اور وادی میں ٹرک، موٹر گاڑیاں دوڑتی رہیں اور کرینیں اور بل ڈوزر شیروں کی طرح دھاڑتے رہے یہاں تک کہ دو سال کا وقفہ پانی کی طرح بہہ گیا اور وہ ڈیم بن کر تیار ہو گیا اس چھوٹے سے مصنوعی سمندر کا پانی بڑی بڑی سرنگوں سے ہوتا ہوا نیچے گرا تو ... ہی ٹربائیں حرکت میں آگئیں اور ان سے لاکھوں کلو واٹ بجلی پیدا ہو کر بے جان تاروں میں زندگی کی رو بن کر دوڑ پڑی اور پانی ڈیم کی نہروں میں چاندی اچھالتا ہوا رواں دواں چل پڑا جہاں ہزاروں لوگ صدیوں سے اپنے اپنے کھیتوں میں کھڑے اُس چاندی کا انتظار کر رہے تھے۔

ڈیم کے ادگھاٹن کے وقت سبھی لوگ خوش تھے۔ بہت خوش۔ اس لئے اُن میں سے کسی کو بھی اُس بوڑھے کا سوال یاد نہ آیا۔ جو یہ پوچھا

www.taemeernews.com

کرتا تھا کہ کیا اس ڈیم کی بجلی کلو کے گھر پہنچے گی، کیا اس نہر کا پانی کلو کے کھیتوں کو ملے گا؟

ڈیم کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی وہاں ڈیم پر کام کرنے والوں کے لئے ہزاروں مکانوں کی ایک بستی بھی بسائی گئی تھی جہاں انھوں نے ڈیم کے بننے کی خوشی میں ملک کے راشٹر پتا مہاتما گاندھی کا ایک قد آدم مجسمہ بھی بستی کے وسطی چوک میں نصب کیا تھا۔ اُس دن اُس کا بھی ادگھاٹن تھا۔

وہ سب لوگ اُس موقع پر مجسمے کے چاروں طرف جمع تھے۔ جب اُس مجسمے سے پردہ ہٹایا گیا تو ملک کا راشٹر پتا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑا تھا۔

لاغر سا جسم، کمر میں لنگوٹی، باقی بدن ننگا۔ ایک ہاتھ میں سوٹی اور آنکھوں پر پتلا سا چشمہ۔ اُس کے ہونٹ ہلتے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے جیسے وہ ان سب سے پوچھ رہا ہو۔

"جس ڈیم کو تم نے بنایا ہے اُس کی بجلی کلو کے گھر گئی ہے یا نہیں اور اُس نہر کا پانی کلو کے کھیتوں کو سیراب کر رہا ہے یا نہیں؟"

www.taemeernews.com

زندگی سے دُور

ایک دن ایلورا کی کچھ مورتیاں خاص طور سے اجنتا کی تصویروں سے ملنے گئیں اور اپنا دکھ درد بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ تاج محل کی موجودگی سے بہت پریشان ہیں۔

"بہت سے لوگ ہماری خوب صورتی کی تعریف کرتے کرتے جب تاج محل کے گن گانے لگتے ہیں تو سر سے پاؤں تک آگ لگ جاتی ہے۔ جی تو چاہتا ہے، ان سے کہہ دیں کہ اگر تاج محل اچھا لگتا ہے تو جاؤ وہیں ایڑیاں رگڑو یہاں کیوں جھک مار رہے ہو؟ لیکن پھر اپنا غصہ اپنے اندر ہی سمو کر رہ جاتی ہیں۔"

ایلورا کی ایک مورتی نے ابھی بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ دوسری بولی: "آج تو غضب ہو گیا۔ دو تیاح کہیں آگرہ ہوتے ہوئے ہمارے ہاں آئے تو میرے سامنے کھڑے ہو کر تاج محل کا ذکر یوں لے بیٹھے جیسے وہ ایلورا میں نہیں تاج محل میں کھڑے ہیں۔ جلی بھنی تو میں پہلے ہی بیٹھی تھی، اُن کا

www.taemeernews.com

روپہ دیکھ کر تو جی میں آئی کہ ابھی دیوار سے سیدھی ان پر گر کر ان کا سر پھوڑ کر رکھ دوں۔ لیکن میرے اندرونی غصے کو اس مورتی نے تاڑ لیا اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔ ورنہ آج تو ان کا کچومر نکل جاتا۔"

اجنتا کی تصویریں تو جیسے پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں۔ ایلورا کی ان دونوں مورتیوں کی بات سن کر ایک نے کہا۔ "ہم تو بہن پہلے ہی اس وجہ سے اتنی پریشان ہیں کہ اکثر دل میں آتی ہے کہ جا کر تاج محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ آخر دھرا ہی کیا ہے وہاں ـــــ سوا اس کے کہ سفید سنگ مرمر کو قرینے سے جڑ کر رکھ دیا گیا ہے اور بیگم ممتاز محل اپنے شوہر کی قبر کے بغل میں اطمینان سے سو رہی ہیں۔ ذرا بیگم کا نخرہ تو دیکھو کہ مقبرہ بھی سفید سنگ مرمر کا بنوایا ہے، جیسے اس کے بغیر مرنے پر بھی آنکھ کھل جاتی!"

دوسری تصویر اترا کر بولی: "قبروں کے علاوہ وہاں ہے کیا، کلا کے نام پر تو وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔"

"تم نے دیکھا ہے اسے؟" کسی نے پوچھا۔

"میری جاتی ہے جوتی۔ ساری دنیا تو ہمیں دیکھنے آتی ہے ہم کسی کو دیکھنے کیوں جائیں؟"

"لوگ دیکھنے تو آتے ہیں اور آتے بھی رہیں گے لیکن جب کوئی ہمیں دیکھتا ہوا اس کا ذکر چھیڑ دیتا ہے تو دل میں کانٹے چبھنے لگتے ہیں۔"

"تو چلو پھر آج اس کانٹے کو ہمیشہ کے لئے نکال ہی دیا جائے۔"

www.taemeernews.com

"ہم لوگ ابھی مل کر چلتے ہیں اور تاج محل کی ساری خوب صورتی ملیامیٹ کر کے رات کو ہی واپس آجائیں گے۔"

یہ تجویز جیسے پہلے ہی سب کے دل میں تھی۔ اسی وقت ایلورا کی مورتیوں اور اجنتا کی تصویروں کی اچھی خاصی تعداد آگرے کی طرف چل دی۔

مورتیاں اور تصویریں ابھی تاج محل کی طرف جانے والے اس راستے پر ہی پہنچی تھیں۔ جس کے دونوں طرف پھولوں کی بہار ہے کہ سامنے "تاج محل کو اندھیرے میں چمکتا دیکھ کر ہی کوئی بے اختیار کہہ اٹھی ـــــ "جگہ تو خوب صورت معلوم ہوتی ہے۔"

دوسری نے طنز کیا: "اگر تمہارا ابھی سے یہ حال ہے تو ہم تمہیں یہیں چھوڑ جائیں گے۔"

اس پر پھر ایک قہقہہ گونج گیا۔

جب وہ کچھ اور آگے گئیں، جہاں فوارے چھوٹتے ہیں تو ایک مورتی بولی: "یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ یہاں کی فضا گپھاؤں کے مقابلے میں بہتر ہے"

دوسری چہکی: "ذرا آگے بڑھ کر قبروں کی فضا دیکھو گی تو پھر پتہ چلے گا کہ بیگم بے چاری پر کیا گزرتی ہو گی۔"

اور آگے بڑھنے کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ پہلے سارا تاج محل دیکھ لیں اس کے بعد ہی اسے برباد کیا جائے گا اس سے یہ منصوبہ بنانے میں بھی آسانی ہو گی کہ اسے کس طرح نیست و نابود کیا جائے۔

www.taemeernews.com

تاج محل دیکھتے ہوئے یوں تو ان میں سے ہر ایک دل ہی دل میں اس کی خوب صورتی کی قائل ہو چکی تھی۔ لیکن دشمنی میں آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے پھر خوب صورت چیز بھی بدصورت دکھائی دیتی ہے اس لئے ہر ایک اس میں کوئی نہ کوئی خامی ہی نکال رہی تھی۔

تاج محل کو باہر سے دیکھنے کے بعد آخر وہ اس جگہ پہنچیں جہاں ممتاز محل کی قبر ہے۔

ایک مورتی چلائی "بھئی جلدی سے باہر چلو۔ میرا تو یہاں دم گھٹ رہا ہے"

میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں کہ جلدی سے جس کام کے لئے آئے ہیں وہ کریں اور پھر چلیں" دوسری نے رائے دی۔

"تو میں شہر دعات بیگم سے ہی کرتی ہوں" ایک اور کو جوش آگیا اور اس نے آگے بڑھ کر بیگم کے چہرے سے کفن الٹ دیا۔

بیگم کا چہرہ نور میں نہایا ہوا اس طرح تر و تازہ تھا۔ جیسے ابھی ابھی تھک کر تھوڑی دیر کے لئے سو گئی ہوں۔

کچھ لمحوں تک سب کی سب مورتیاں بے خود ہو کر بیگم کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر ایک بڑے سے شیشے میں ایک مورتی نے پہلے خود کو دیکھا اور پھر بیگم تاج محل کو، اور پھر خوشی اور حیرانی سے چلاتی ہوئی بولی "ارے یہ تو میں سو رہی ہوں!! دیکھو! دیکھو! ہو بہو میں ہوں۔ کلاکار نے اسی کو دیکھ کر مجھے بنایا ہے۔ مجھے تو اپنی زندگی دیکھنے کو مل گئی ہے"

www.taemeernews.com

"ارے تاج محل کو ہوئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ روز نہیں ہوئے اور تم تو اس سے سینکڑوں برس پرانی ہو" ایک تصویر نے اعتراض کیا۔

دوسری بولی: "تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ جب تمہیں بنایا گیا تھا اس وقت بی بی ممتاز محل تو پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں"

"معلوم ہوتا ہے بیگم کے شاہی رعب میں آکر یہ اپنے اوسان کھو بیٹھی ہے"

"تو پھر میں نے ہی گپھاؤں سے آکر ممتاز محل کے روپ میں جنم لیا ہوگا یقین نہیں آتا تو تم لوگ بھی دیکھو۔ یہ بالکل میں ہوں۔ بہرصورت یہ ہے میری ہی زندگی کا روپ"

غصے میں آکر اب کی بار اجنتا کی ایک تصویر آگے بڑھی اس نے ایک نظر بیگم کو دیکھا اور پھر شیشے میں اپنا عکس دیکھ کر چیخی: "ارے! میری شکل بھی بیگم سے ملتی ہے۔ اس قبر میں تو میں سو رہی ہوں"

اور آخر میں وہ سب اس نتیجے پر پہنچیں کہ ممتاز محل اور وہ سب ایک ہی روپ ہیں۔ ایک ہی حسن۔

جس مورتی نے بیگم کا کفن اٹھایا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو ایک بار پھر دیکھا اور پھر بڑے احترام سے بیگم کے چہرے کو پھر اسی طرح ڈھک دیا۔ اتنے میں کوئی مورتی باہر سے ڈھیر سے پھول لے آئی۔ انھیں وہاں رکھ کر واپس آتے ہوئے ہر مورتی بار بار پلٹ کر تاج محل کو دیکھ رہی تھی۔ اور ہر ایک کے دل میں یہ دکھ تھا کہ وہ ہر لمحے اپنی زندگی سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

www.taemeernews.com

ایک عام آدمی

میں تھا تو ایک عام سا آدمی۔ معمولی انسان جسے زندہ رہنے کے لئے ہر سانس مول دے کر خریدنا پڑا۔ ایک لمحے سے دوسرے لمحے کے فاصلے کو پاٹنے کے لئے آسمان کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا کر بازوؤں پر تول کر ڈھونا پڑا، لیکن مرنے کے ساتھ ہی جیسے زندگی بدل گئی۔ میری لاش مہکتے ہوئے تازہ پھولوں سے ڈھکی تھی۔ بہت ہی عمدہ زنگ بز نگا پلیٹ فارم تھا وہ جس پر میری لاش قرینے سے رکھی تھی۔ میرے چاروں طرف انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو اس طرح اداس اور غمگین تھا جیسے اُن کے لئے یہ سب سے پہلا موت کا سانحہ ہو۔ میرے لئے وہ سب کے سب نئے چہرے تھے۔ میں اُن میں سے کسی کو نہیں پہچانتا تھا، زندگی میں، میں نے اُن میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اُس وقت میری موت پر وہ یوں رو رہے تھے جیسے اُن کا کوئی عزیز ترین محبوب مر گیا ہو۔

اپنے لیے اتنے لوگوں کو غمناک دیکھ کر مجھے اپنی موت کا بھی

www.taemeernews.com

افسوس نہ رہا۔ یوں مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں کیونکر اور کن حالات میں مرا ہوں۔ ہاں یہ افسوس ضرور ہو رہا تھا کہ اگر مرنے کے بعد میری اہمیت اس قدر بڑھ جانی تھی، تو مجھے بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا زندگی میں قدم قدم پر بے کار ٹھوکریں کھاتا رہا۔

اس وقت میں اس قدر ہلکا پھلکا اور خوش تھا کہ احساس ہو رہا تھا جیسے موت مجھے زندگی بھر کی صعوبتوں کا صلہ دے رہی ہو۔

تبھی مجھے احساس ہوا کہ انھوں نے میری لاش کو کندھوں پر اٹھا لیا اور آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ جو لوگ بار بار میری لاش کو کندھا دے رہے تھے وہ سب کے سب بہت بڑے آدمی معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ بڑے احترام سے میری لاش کے پیچھے اور ارد گرد چل رہے تھے اُن سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئیں۔ جن سے پتہ چلتا تھا کہ وہ میرے مرنے کے غم میں بہت روئے تھے۔

جس طرف سے میرا جنازہ گزر رہا تھا۔ اس راستے پر ہزاروں آدمی، لاکھوں آدمی، کروڑوں آدمی، قطار در قطار سر نیچا کئے کھڑے تھے۔ میں نے زندگی میں ایک ساتھ اتنے آدمی کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس لئے مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے سارے کرۂ ارض کے انسان وہاں پر سمٹ کر آ گئے تھے۔

کافی دیر چلنے کے بعد ایک بہت بڑے تالاب کے کنارے جس کی دور تک دکھائی دیتی سیڑھیاں سفید پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ انھوں نے میری لاش کو رکھا۔ قریب ہی آٹھ دس ہاتھ اونچی، خوشبودار لکڑی کی

www.taemeernews.com

بہت بڑی چتا تیار تھی۔ اُس پر انھوں نے سب سے پہلے پھولوں کی موٹی سی تہہ بچھائی اور پھر میری لاش کو آہستگی سے رکھ دیا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ بہت ہی حسین اور دلکش۔ سورج غروب ہو چکا تھا لیکن رات کا اندھیرا ابھی پہاڑوں کے اس پار سہما کھڑا تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی فضا میں یوں اٹک سی گئی تھی جیسے وقت ساکت ہو گیا ہو۔ میرے ارد گرد پھیلا ہوا زندگی کا ہجوم اُداس تھا اور خاموش جیسے موت نے صرف مجھے ہی نہیں اُن سب کو مار دیا تھا۔

پھر اُس خاموش اور جامد لمحے میں کچھ حرکت ہوئی۔ کچھ لوگوں نے ہلنا شروع کیا۔ کچھ لوگوں نے بولنا شروع کیا۔ جس طرف یہ حرکت اور شور زیادہ تھا سب کی توجہ اس طرف مرکوز ہو گئی۔ لوگ اُچک اُچک کر دیکھنے لگے کہ کیا بات ہے۔

تبھی فضا میں ایک اور جنازہ ابھرا۔ کچھ لوگ ایک اور جنازے کو اپنے کندھوں پر اُونچا اٹھائے ہوئے چتا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس لاش کے سلسلے میں لوگ بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ہر شخص آگے بڑھ کر اُس لاش پر پھول برسا رہا تھا۔ تبھی یہ راز کھلا کہ وہ سب لوگ دراصل اس خاص آدمی کی آخری رسوم کے لئے وہاں اکٹھا ہوئے تھے۔ وہ خوشبودار لکڑی کی چتا اُس کیلئے بنائی گئی تھی۔ میری لاش تو وہ چند کارندوں کی غلطی کی وجہ سے اٹھا لائے تھے

تبھی کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آگے بڑھے اور چتا پر چڑھ کر انھوں نے میری لاش کو ایک طرف اچھال دیا۔ پھر چتا کو پوتر کرنے کے لئے انھوں نے اس پر پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ پھولوں کی ایک اور تہہ بچھائی اور اس پر بصد احترام اُس خاص

www.taemeernews.com

آدمی کی لاش کو رکھا گیا ـــــ دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں اُداس ساز گونج اٹھے لاکھوں کروڑوں لوگوں نے جھک کر اس لاش کو آخری سلام کیا اور پھر اس چتا کو جلا کر وہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

جب وہ لوٹ رہے تھے تو میری لاش اُن لاکھوں کروڑوں پاؤں کے نیچے روندتی چلی گئی۔ کچلتی چلی گئی۔ میرے جسم کی بوٹی بوٹی الگ ہوگئی ہڈی ہڈی بکھر گئی ـــــ پھر میرے جسم کی بوٹیاں، میری ہڈیوں کے ٹکڑے ان لوگوں کی ٹھوکروں سے، ان کے پاؤں سے الجھتے ہوئے ان کے گاؤں میں چلے گئے ان کے شہروں میں چلے گئے۔ ان کی ہر گلی اور ہر راستے پر بکھر گئے اس کے ساتھ ہی بکھر گئی میری لاش کی بدبو، ان کے گھروں میں۔ ان کے محلوں میں ان کے شہروں میں ان کے ملکوں میں۔

اس بدبو کو ختم کرنے کے لئے ماحول کو پاک و صاف اور صحت مند بنانے کے لئے کچھ لوگوں نے آواز اٹھائی کہ ان بوٹیوں کو آگ میں جلا دیا جائے یا مٹی میں دبا دیا جائے لیکن ہوا یہ کہ جن لوگوں نے زیادہ زور دیا دنیا والوں نے انھیں سولی پر لٹکا دیا۔ زہر پینے پر مجبور کیا اور یا پھر قتل کر دیا۔

اور ہزاروں برسوں سے میری لاش کے ٹکڑے اسی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ ہر گلی میں، ہر موڑ پر ہر محلے میں، ہر شہر اور ہر ملک میں اور پتہ نہیں اس طرح کب تک بکھرے رہیں۔

---

www.taemeernews.com

سمندر کی پیاس

اپنے ہونٹوں پر سمندر کی پیاس لے کر میں نے اپنی محبوبہ کے دروازے پر الکھ جگاتے ہوئے دستک دی۔ وہ سورج کی آب و تاب کے ساتھ دروازے پر طلوع ہوئی۔ نسیم سحر کی طرح آہستہ سے مسکراتے ہوئے۔ اس نے جب میرا استقبال کیا تو میں نے اپنی زندگی کے خالی کاسے کو اس کی طرف بڑھا دیا اور کہا کہ وہ اسے اپنی محبت سے لبریز کر دے تاکہ میری صدیوں کی پیاس مٹ سکے۔

وہ تھوڑا سا اور مہربان ہوئی۔ تھوڑا سا اور مسکرائی اور کہا۔ "میرے گھر کے سامنے یہ جو میدان ہے۔ تم اس کا ایک چکر کاٹ کر آؤ۔ تب تک میں اپنے وجود کی ساری محبت اکٹھی کرتی ہوں تاکہ تمہارا کاسہ پوری طرح بھر سکے۔ تاکہ میری پیاس بھی پوری طرح مٹ سکے۔ مجھے بھی تو صدیوں سے تمہارا انتظار تھا!" میں نے دیکھا اس کے ہونٹوں پر بھی میری طرح سمندر کی سی پیاس تھی اور وہ بے چینی سے

www.taemeernews.com

تڑپ رہے تھے۔

اپنی پیاس کو بھول کر مجھے اس کے ہونٹوں کی پیاس نے اور بھی تڑپا دیا اور میں دیوانہ وار اس کے گھر کے سامنے پھیلے میدان کا طواف کرنے کے لئے دوڑ پڑا۔

لیکن میدان تھا کہ پھیلتا ہی جاتا تھا۔ فاصلہ تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ افق تا افق کہیں ختم ہونے پر ہی نہیں آتا تھا۔

اس راستے میں مجھے لاکھوں کروڑوں عورتیں ملیں۔ ایک سے ایک خوبصورت۔ ایک سے ایک پیاسی۔ کالی عورتیں۔ سانولی عورتیں زرد عورتیں۔ گوری عورتیں۔ اپنے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے انھوں نے میرے راستے میں پھول بچھا دیئے۔ اپنی آنکھوں کے چراغوں سے انھوں نے میرے راستوں کو روشن کیا۔ اپنے جسموں کی خوشبو سے انھوں نے میرے راستوں کو مہکایا۔ صرف اس امید پر کہ میں ان کے ہونٹوں کی پیاس مٹانے کے لئے ایک لمحہ رک جاؤں۔

لیکن میرے پاؤں متواتر دوڑتے ہی رہے۔ تیز سے تیز تر۔ تاکہ جلد سے جلد اپنی محبوبہ کے پاس پہنچ کر اپنے پیار کو حاصل کر سکوں۔

میں نے کسی مسکراہٹ کی طرف آنکھ بھر کر نہ دیکھا۔ کسی بھی خوشبو کے نزدیک تک نہ پھٹکا۔ تاکہ میری محبوبہ کو انتظار کا دکھ نہ برداشت کرنا پڑے۔

اور آخر ایک لمبی جان لیوا مسافت کے بعد میں نے پھر اپنی محبوبہ

www.taemeernews.com

کے دروازے پر دستک دی۔ اب کی وہ ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح رونما ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی سمندر کی پیاس دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی اور دوسرے ہی لمحے مسکرا کر میری زندگی کے کاسے کو اپنی محبت سے لبریز کر دے گی۔

لیکن ابھی تک اس کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ نہیں ابھری تھی جو میں نے صبح دیکھی تھی۔ مسکراہٹ جس سے میرا دل کھلتا۔ مسکراہٹ جسے حاصل کرنے کے لئے میں نے لاکھوں مسکراتے ہوئے ہونٹوں کی طرف نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ مسکراہٹ جسے حاصل کرنے کے لئے ابھی ابھی میں نے ایک لمبی مسافت طے کی تھی۔

جب کافی دیر تک کچھ نہیں ہوا تو میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ لانے کے بجائے اداس سی ہو کر بولی "جو آدمی میرے ہونٹوں کی طرح پیاسے، لاکھوں پیاسے ہونٹوں کو، پیاسا ہی چھوڑ کر چلا آئے، جو آدمی میری مسکراہٹ سی لاکھوں مسکراہٹوں کو نظر انداز کر آئے۔ اس آدمی سے میں یہ کیسے امید کر سکتی ہوں کہ وہ میری صدیوں کی پیاس کو مٹا سکے گا۔ یا میری مسکراہٹ کی قدر کر سکے گا۔ تم میری محبت کے قابل نہیں ہو"

یہ کہتے ہوئے اس نے لرزتے ہوئے ہونٹوں اور بھری ہوئی آنکھوں سے دروازہ بند کر لیا۔ اور میں تھکے ہوئے قدموں سے واپس لوٹ آیا۔

دور اُفق میں سورج غروب ہو رہا تھا۔

www.taemeernews.com

دوڑتی دھوپ

اپنی اپنی زندگی کا بوجھ اپنے سروں پر لادے خانہ بدوشوں کا کارواں سورج کی دھوپ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ وہ کارواں ایسی جگہ پر قیام کرنا چاہتا تھا، جہاں دھوپ ہو، زندگی کی گرمی ہو، ہری بھری گھاس ہو، کسی ندی کا کنارہ ہو، جہاں زندگی بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہ سکے۔

لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ کبھی ندی کا کنارہ نہ ہوتا تو کبھی ہری بھری گھاس نہیں ہوتی اور اگر یہ دونوں چیزیں کہیں ایک ساتھ مل بھی گئیں تو سورج کی دھوپ نہ ہوتی۔

صبح جب انھوں نے پہاڑ کی غار کے اندھیرے سے باہر نکل کر اپنے سفر کا آغاز کیا تھا تو مطلع ابر آلود تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ جس کی ٹھنڈک ان کے جسموں کو تیز کیے دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چلتے پھرتے جاندار انسان نہ ہو کر لمبے لمبے برف کے تودے

www.taemeernews.com
HARDAYAL PUBLIC LIBRARY, DELHI,
Acc. No....11925............ 25

ہوں۔ جن کو ہوا۔ تیز ہوا اپنی لپیٹ میں لئے کسی سمت بہائے لے جا رہی تھی۔

اور وہ چلے جا رہے تھے۔ ان کے سروں پر ان کی زندگیوں کا بوجھ تھا۔ اور اس بوجھ کے مارے ان کے سر جیسے پتھر کے ہو گئے تھے جیسے انھیں احساس ہی نہیں تھا کہ جب سر پر بوجھ ہوتا ہے تو درد ہوتا ہے۔ درد ہوتا ہے تو آدمی ہائے کرتا ہے۔ اور یہ ہائے دل سے ہوک بن کر اٹھتی ہے تو ہونٹ کانپ اٹھتے ہیں۔ اور ہونٹ تب کانپتے ہیں جب زبان پتھر کی ہو جاتی ہے اور گلا رندھ جاتا ہے۔ اور پھر ہونٹوں سے آواز نکلتے ہی وہ فضا میں پھیلنے سے پہلے انسان کے چہرے پر بل چلاتی ہے تو نرم رخساروں پر اور حسین ماتھے پر جو نقش ابھرتے ہیں تو سارے چہرے کی شکل ہی بگڑ جاتی ہے۔ آدمی ہی بدل جاتا ہے اور اسے اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ انسان کے درد بھرے چہرے کو چھو کر جب ہوا آگے نکلنے لگتی ہے تو ہوا کے درد ہونے لگتا ہے۔ اور اس طرح انسان کا درد ساری فضا ساری کائنات میں پھیل جاتا ہے اور درد کے مارے ہوا چیخ اٹھتی ہے تو اس کی چیخ کو سن کر وہ درد کا مارا انسان خوف سے کانپ اٹھتا ہے۔

لیکن اس کارواں کے انسانوں کے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہو رہا تھا جیسے وہ تمام احساسات اور محسوسات سے عاری ہو گئے تھے۔

وہ تو صرف آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ اس امید میں کہ ابر چھٹیں گے

www.taemeernews.com

آسمان پر سورج نمودار ہوگا اور اس کی دھوپ ہوگی۔ اس دھوپ میں گرمی ہوگی۔ جس کا لطف وہ زندگی میں پہلی بار اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ سورج کتنا عظیم ہوتا ہے۔ دھوپ کتنی حسین ہوتی ہے اور اس کی گرمی کتنی لطیف ہوتی ہے۔

سفر کے آغاز کے وقت ان کے خدا نے ان کو بشارت دی تھی کہ اے انسانوں۔ تم زندگی کے سفر پہ چل دو۔ چل دو اس زمین پر اور بکھر جاؤ اس زمین کے شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک۔ اور ایک دن ایسا آئے گا جب سورج اس کی دھوپ اس کی گرمی تمہاری زندگیوں کو روشن کر دے گی اور وہ تب سے چل رہے ہیں۔ راستے میں بڑے بڑے جنگل آئے۔ گہری کھائیاں آئیں اور وہ سب کو پار کرتے چلے آئے ہیں۔ ان مشکلوں سے گزرتے ہوئے ان کے ہزاروں لاکھوں ساتھی اپنی جان سے ہاتھ گنوا بیٹھے لیکن کاروان والوں نے اپنے سفر کو نہ روکا۔ وہ اسی جگہ پڑاؤ کرنا چاہتے ہیں جہاں سورج ہو۔ دھوپ ہو گرمی ہو۔

اور ابر نہیں چھٹتا۔ کبھی کبھی ابر دور کہیں چھٹتا ہے اور سورج کی دھوپ دوری پر نظر آتے ہی ان کی پتھر کی آنکھوں میں روشنی آجاتی ہے۔ ان کے بے جان وجود میں جان آجاتی ہے اور وہ اپنے سروں پر زندگیوں کا بوجھ اٹھائے اس دھوپ کی طرف دوڑ پڑتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی وہ دھوپ کے قریب پہنچتے ہیں تو کالا ابر پھر کہیں

www.taemeernews.com

سے آکر ان کے آسمان پر پھیل جاتا ہے اور دھوپ دور بھاگ جاتی ہے

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کارواں والوں نے دیکھا کہ قریب ہی دھوپ ان کی آنکھوں کے سامنے قریب ایک فرلانگ کے فاصلے پر موجود ہے وہاں ریل کی پٹری پر دیں دھوپ میں نہائی ہوئی خوشیوں سے وسلیں مارتی تیز تیز دوڑتی جا رہی تھی۔

قافلے والوں کے چہروں پر دھوپ کی طرح کی خوشی چمک اٹھی! اس سے پہلے چونکہ انھوں نے دھوپ کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا اس لئے جیسے جیسے وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے دھوپ کے نزدیک ہو رہے تھے۔ ویسے ویسے ان کے چہروں سے ان کے صبر آزما سفر کا درد مٹتا جاتا یہاں تک کہ دھوپ ایک قدم پر رہ گئی۔ قافلے والوں نے اپنے سروں سے اپنا اپنا بوجھ زمین پر گرانے کے لئے بازو اٹھائے۔ بوجھ کو اپنے اپنے بازوؤں پر تولا۔ اور قریب تھا کہ اسے چمکتی دھوپ میں گرا دیں تبھی بادل ایک مرتبہ پھر کہیں سے آئے اور آن کی آن میں دھوپ اس طرح تیز بھاگ گئی جیسے ریل گاڑی ان کی نظروں سے کب کی دور ہو چکی تھی۔

اب پھر وہ قافلے والے ہیں۔ ان کی زندگیوں کا بوجھ ہے۔ ان کے درد بھرے چہرے ہیں۔ جن کی عکاسی اس وقت مشکل ہو رہی ہے۔ کیونکہ اب حد نظر تک بادل ہی بادل ہیں۔ کالے گہرے بادل اور دھوپ کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

www.taemeernews.com

آخری اُداس آدمی

وہ گنتی میں پچاس تھے۔ اکاون بھی ہو سکتے تھے لیکن اس ہال میں جہاں وہ سب مِل کر روز کسی نہ کسی کا سوگ منایا کرتے تھے۔ صرف پچاس آدمیوں کے لیٹنے ہی آسانی سے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اس لئے ان کی گنتی پچاس ہی رہ گئی۔

وہ پچاس شخص جن میں پچیس آدمی پچیس عورتیں شامل تھیں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سوگ ہال میں روز شام کو ۶ بجے سوگی لباس یعنی کالے کپڑے پہن کر اکٹھے ہوتے۔ ٹھیک ۶ بجے ان کا سکرٹری اسٹیج پر آتا اور پانچ منٹ کی مختصر سی تقریر میں بتاتا کہ سوگ کلب کے ممبر ہر روز کسی نہ کسی کا سوگ منا کر اور اس طرح اس انسان کو یاد کر کے جو اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے انسانیت کی کتنی بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ پھر گزشتہ روز منائے گئے سوگ کی کامیابی کے لئے سب ممبروں کو مبارکباد دیتا۔ اس موقعے پر تالیاں بھی بجتیں۔ جیسے ہی تالیوں کی آواز

www.taemeernews.com

ڈوبتی۔ سکرٹری اداس ہو جاتا اور پھر جس آدمی کا سوگ منانا اس دن کے ایجنڈے میں شامل ہوتا۔ اس کے بارے میں جو جو معلومات اسے پتہ ہوتیں انھیں بیان کرتا اور پھر جب وہ اپنی تقریر اس جملے پر ختم کرتا کہ آؤ ہم سب مل کر اس شخص کی موت کا سوگ منائیں تو ہال میں کہرام مچ جاتا۔

کوئی چیخ رہا ہے۔ کوئی دھاڑیں مار رہا ہے کوئی چھاتی پیٹ رہا ہے۔ کسی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ رہی ہے جس کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے وہ غم کے مارے گم سم اس طرح سمٹ کر ایک کونے میں بیٹھا ہے کہ اگر یہ غم کسی طرح پھوٹ کر باہر نہ نکلا تو شاید اس کا جسم ہی پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ غم کی شدت جب انتہا تک پہنچتی تو وہ لوگ ایک دوسرے سے لپٹ کر روتے۔ کبھی کبھی جب ان میں سے کوئی روتا روتا بے ہوش ہو جاتا تو دوسرے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اس کے منہ میں پانی ڈال کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے۔ ان میں سے ایک عورت جس پر اکثر بے ہوشی کے دورے پڑتے تھے وہ خاص طور پر کسی کے ساتھ لپٹ کر ہی روتی تاکہ گرتے وقت اسے کوئی تھام لے۔

آدھے گھنٹے بعد جب وہ طوفان تھمتا تو وہ لوگ ایک دوسرے کو چپ کرانے کی کوشش کرتے۔ ایک دوسرے کے آنسو پونچھتے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے غسل خانوں کی طرف جاتے۔ جہاں وہ ہاتھ دھونے

www.taemeernews.com

کے بعد دوبارہ اس ہال میں گرم گرم چائے یا کافی پیتے ہوئے ایک دوسرے کے رونے کے انداز کی تعریف کرتے: "بھئی آج تو انھوں نے کمال کر دیا کیا شاندار چیخ ماری!" "بھئی تمہارے آنسوؤں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور وہ تو بالکل بت بن جاتا ہے۔ جیسے لکڑی کا بے جان مجسمہ۔ کوئی ایسا کر کے تو دکھائے"

اس طرح ایک گھنٹے کے بعد وہ واپس اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے اگلی شام ۶ بجے پھر اکٹھے ہونے کے لئے۔

اس طرح یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا۔

پھر یہ ہوا کہ اُن پچاس میں سے ایک آدمی مر گیا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا اور اس طرح اب صرف ایک آدمی بچا ہے۔

وہ اب بھی اپنے بوڑھے قدموں سے چلتا ہوا روز ۶ بجے اس ہال میں آتا ہے۔ کسی کی یاد میں اسی طرح روتا ہے اور پھر اداسی کا بت بنا ہوا خاموش سا بھرے بازار سے گزرتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیتا ہے جہاں اب اسے کسی شخص کے مرنے کا دکھ ہوتا ہے وہاں اُسے اس بات کا بھی غم کھائے جا رہا ہے کہ وہ جو سب کے مرنے پر روتا رہا ہے۔ اس کی موت کے بعد اس بھری دنیا میں کوئی اسے رونے والا اس کی یاد میں آنسو بہانے والا بھی نہیں ہوگا

---

www.taemeernews.com

واپسی

وہ صبح نو بجے کافی ہاؤس کھلتے ہی ایک کرسی پر آکر جم گیا تھا اور شام ہونے تک وہ اس طرح بے فکری سے بیٹھا رہا جیسے اسے کوئی کام نہ ہو۔

اس بیچ میں کافی ہاؤس سے اٹھنے کے لئے کئی موقع آئے تھے۔ ایکبار اس کے دوست نے کہا تھا: آؤ اسمبلی کا سیشن دیکھ آئیں۔ سنا ہے آج بڑا ہنگامہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے سرکار کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جائے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

"تم ہو آؤ۔" اس نے بڑی بے پروائی سے کہا تھا۔ "کوئی سرکار رہے یا جائے، اپنے رام سے کیا؟"

دوسری بار یہ ہوا کہ باہر سڑک پر سے نعرے لگاتا ہوا جلوس گزرا یہ جاننے کے لئے کہ کون لوگ ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ کافی ہاؤس کے کافی آدمی تھوڑی دیر کے لئے برآمدے میں جاکر کھڑے ہو گئے تھے۔ جو نہیں گئے تھے انھوں نے بھی بڑی بے چینی سے باہر سے آنے والوں سے پوچھا

www.taemeernews.com

تھا کہ جلوس کیسا تھا۔ لیکن وہ اسی طرح خاموشی سے بیٹھا کافی ہاؤس کی دیوار پر ٹنگی ہوئی اس کالی سی لڑکی کی تصویر دیکھتا رہا جو کافی پیتی ہوئی بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔

اس تصویر کو اس نے صبح سے کئی بار دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی گنا تھا کہ کافی ہاؤس میں کتنی کرسیاں ہیں۔ کتنی میزیں ہیں۔ ایک وقت میں کتنے آدمی بیٹھے ہیں۔ دیواروں پر کتنے لیمپ ہیں۔ چھت سے کتنے پنکھے لٹک رہے ہیں۔

پھر اس کو گھر سے ایک آدمی بلانے آیا تھا۔ "تمہارے ماموں آئے ہیں گھر پر بلا رہے ہیں۔ وہ شام کی گاڑی سے لوٹ جائیں گے"۔ اس نے پیغام چپ چاپ سن لیا تھا اور پھر گننے لگا تھا کہ اس کی میز کے شیشے پر کتنی خراشیں پڑی ہیں۔

جب وہ بلاوے پر بھی گھر نہیں گیا تو اس کے کچھ دیر بعد اسے ایک بُری خبر ملی۔ اس کے ایک قریبی دوست کو حادثہ پیش آ گیا تھا اور اسے شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا تھا۔ جن صاحب نے اسے خبر دی تھی وہ خود بہت گھبرائے ہوئے تھے اور ہسپتال جانے کی جلدی میں تھے وہ کافی ہاؤس میں صرف اس لئے آئے تھے کہ اسے حادثے کی اطلاع دیتے جائیں اسے بھی چاہیئے تھا کہ خبر سنتے ہی ہسپتال کی طرف چل دیتا۔ لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

شام کے نو بج گئے تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی کافی ہاؤس میں داخل ہوا۔

www.taemeernews.com

"ارے بھیا آپ کو نوکری مل گئی۔ گھر میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں اور آپ یہاں بیٹھے ہیں!"

"کہاں؟ کیا؟ نوکری؟"

"ہاں۔ ہاں آپ کلکتہ گئے تھے انٹرویو میں؟ انھوں نے تقرری کا خط بھیجا ہے۔ آپ کو اگلے پیر تک وہاں پہنچ جانا ہے۔"

"سچ؟"

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ شام کی ڈاک سے چٹھی آئی ہے۔"

نوکری ملنے کی بات سنتے ہی اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے۔ پھر اسے کچھ یاد آیا اور وہ جلدی سے کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا "لو یہ پیسے۔ میرا کافی کا بل دے دینا۔ میں ذرا ہسپتال تک جا رہا ہوں حمید کا کار سے حادثہ ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں وہ کیسا ہے؟ اگر مجھے گھر پہنچنے میں دیر ہو جائے تو کہہ دینا کہ فکر نہ کریں۔ اور ہاں ماموں سے کہنا کہ وہ آج نہیں کل جائیں گے۔"

جب وہ ہسپتال جانے کے لئے رکشا پر بیٹھ رہا تھا تو اسے نیر نظر آ گیا جو صبح اسے اسمبلی ہاؤس لے جانے کی ضد کر رہا تھا۔ اس نے نیر کو زبردستی اپنے ساتھ رکشا پر بٹھایا اور پوچھنے لگا: ہاں تو سناؤ یار۔ اسمبلی میں کیا ہوا آج؟"

www.taemeernews.com

یوماسٹر

ڈھیلی ڈھالی پگڑی۔ ڈاڑھی کے بال کھلے ہوئے۔ ادھیڑ عمر میں بھی لال رنگ کے چہرے پر چمکتی ہوئی دو ذہین آنکھیں — یہ ہے یوماسٹر کی شخصیت نام ہے ہزارہ سنگھ۔ لیکن اس نام سے سکول کے بہت کم ہی لوگ انھیں جانتے ہیں ایک دفعہ تو ان کے گاؤں سے آئے ہوئے ایک آدمی کو تقریباً ایک گھنٹہ بھر پریشان ہونا پڑا۔ وہ صاحب اسکول کے کسی طالب علم سے پوچھ بیٹھے۔ مجھے ماسٹر ہزارہ سنگھ سے ملنا ہے۔ لڑکے نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا۔ "اس نام کا کوئی بھی ماسٹر اس اسکول میں نہیں پڑھاتا" جب ان صاحب نے بتایا کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہزارہ سنگھ صاحب اس اسکول میں بیس سال سے پڑھا رہے ہیں، تو لڑکے کو بہت تعجب ہوا۔ اس نے دو ایک اور لڑکوں سے پوچھا۔ انھوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ صاحب واقعی پریشان ہوگئے۔ اتنے میں ایک ماسٹر صاحب ادھر سے گزرے تو انھوں نے مسکراتے ہوئے ایک لڑکے سے کہا۔

"آپ کو یوماسٹر سے ملا دو"

www.taemeernews.com

یو ماسٹر صاحب جب اپنی کلاس کی طرف پڑھانے کے لئے جاتے تو لڑکوں کی ٹولیوں میں سے کوئی لڑکا آواز بدل کر "یو ماسٹر" کہہ دیتا۔ وہ اغل بغل گردن گھما کر دیکھتے تو لڑکے دوسری باتوں میں اس طرح محو ہو جاتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ آگے بڑھتے تو کہیں سے اور اونچی آواز آتی "یو ماسٹر" "یو ماسٹر" دوسری دفعہ ماسٹر صاحب جھانک کر نہ دیکھتے۔ بلکہ ان کے قدم اور تیز ہو جاتے۔ اور وہ جلدی جلدی اپنے کلاس روم میں پہنچ جاتے۔ کلاس روم میں بھی بعض اوقات بلیک بورڈ پر بڑے بڑے حروف میں "یو ماسٹر" لکھا ہوا ملتا یہ دیکھ کر وہ اپنے پیر پٹختے ہوئے جلدی جلدی بورڈ صاف کر دیتے۔ لڑکوں کے شور کو کم کرنے کے لئے دو تین مرتبہ زور زور سے رول کو پٹختے، پھر کلاس میں سناٹا چھا جاتا اور وہ پڑھانا شروع کر دیتے۔ انھوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ نوٹس بورڈ پر "یو ماسٹر" لکھ کر انھیں چڑھانے کی کوشش کس نے کی تھی۔

آج سے پندرہ بیس سال پہلے جب لڑکوں نے انھیں یو ماسٹر کہنا شروع کیا تھا تب انھوں نے شروع شروع میں بہت سختی کی تھی۔ ہر لڑکے کو خوب سزا دی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب تک رپورٹیں کیں۔ انھوں نے بھی لڑکوں کو سزا دی۔ کئی ایک پر جرمانے کئے گئے۔ گھر پر رپورٹیں بھجوائیں۔ لیکن نتیجہ ہمیشہ اُلٹا ہی نکلا۔ جتنا ہی وہ اس نام کا بُرا مانتے تھے۔ اتنا ہی اس نام کو ان کی شخصیت سے منسوب کیا جاتا تھا۔ اور اس طرح یو ماسٹر کا نام سینہ بہ سینہ بیس سال سے چلا آ رہا ہے۔

www.taemeernews.com

ماسٹر صاحب نے خود اپنی خامی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی تھی جس کی وجہ سے انھیں "یو ماسٹر" کہا جاتا تھا۔ کلاس میں پڑھاتے وقت انھیں سوال کرنے کی بہت عادت تھی۔ ایک لڑکے سے سوال پوچھنے کے بعد وہی سوال دوسرے سے پوچھنا ہوتا تو وہ اس کا نام لینے کے بجائے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے۔

"یو"۔ اور پھر یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک گھنٹی نہ بج جاتی، پھر آہستہ آہستہ یہ لفظ "یو" ان کی شخصیت سے اس قدر منسوب ہو گیا کہ کبھی وہ بازار میں جا رہے ہوتے تو وہاں بھی انھیں کہیں کہیں یہ الفاظ سننے کو مل جاتے ــــ "وہ دیکھو ہمارا یو ماسٹر جا رہا ہے"۔ اور اس طرح اس چھوٹے سے شہر میں بچہ بچہ ان کو یو ماسٹر کے نام سے جاننے لگا۔

جہاں تک لڑکوں کے انھیں یو ماسٹر کہنے کا سوال تھا۔ یہ تو اب بالکل معمولی بات تھی۔ اب وہ لڑکوں کے یو ماسٹر کہنے پر بگڑتے بھی نہیں تھے کسی کو سزا بھی نہ دیتے تھے۔ یوں بھی وہ بچوں کو سزا دینے کے حق میں نہیں تھے۔ اور نہ ہی انھوں نے کبھی کسی بچے کو سبق نہ یاد کرنے پر پیٹا تھا ہمیشہ محبت اور محنت سے پڑھاتے۔ بچہ سبق بھول جاتا تو اطمینان سے دوبارہ سہ بارہ بتاتے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی کلاس کا نتیجہ ہمیشہ اچھا رہتا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ایک ماسٹر نے انھیں "یو ماسٹر" کہہ دیا۔ اس دن وہ یوں بھی کچھ پریشان تھے۔ گھر سے چلنے سے پہلے بیوی سے ایک چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ سکول کی طرف چلے تو راستے میں سائیکل بھی پنکچر

www.taemeernews.com

ہوگیا۔ پیدل چلنے لگے تو جوتے کی ایک کیل پاؤں میں گڑنے لگی ـــــ اور اس تکلیف کی وجہ سے کالج پہونچنے میں دیر ہوگئی۔ پریشان تو تھے ہی کلاس روم کی طرف جارہے تھے کہ پیچھے سے ایک ماسٹر صاحب نے آواز دی ـــــ "یو ماسٹر"

"یو ماسٹر" کے الفاظ سن کر وہ بھنا ہی تو گئے۔ جب گھوم کر دیکھا تو قریب سے لڑکوں کی ایک ٹولی میں سے قہقہہ بلند ہوا اور یو ماسٹر کا غصہ آپے سے باہر ہوگیا۔ وہ ماسٹر صاحب پر برس پڑے۔

"آپ کو شرم نہیں آتی۔ میرا مذاق اڑاتے ہوئے۔ میں ابھی ہیڈ ماسٹر صاحب سے رپورٹ کرتا ہوں۔ جتنا کسی کا لحاظ کرو اتنا ہی سر پر چڑھنے لگتا ہے۔"

دوسرے ماسٹر صاحب نے معافی مانگی۔ اور کہا کہ آپ کو ہیڈ ماسٹر صاحب بلا رہے ہیں۔

"بھاڑ میں گئے آپ اور ہیڈ ماسٹر صاحب۔ میں پوچھتا ہوں آپ نے یو ماسٹر کیوں کہا۔ میں ہزارہ سنگھ ہوں ہزارہ سنگھ یہ بدتمیزی برداشت نہیں کرسکتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ کلاس روم میں گئے۔ اس ماسٹر کے خلاف رپورٹ لکھی۔ اور ہیڈ ماسٹر کو دینے کے لئے چل دیئے۔ کلاس کے لڑکے ماسٹر صاحب کے غصے کی نوعیت کو بھانپ گئے تھے۔ اس وقت کسی نے انھیں یو ماسٹر نہیں کہا۔ بلیک بورڈ پر لکھے ہوئے "یو ماسٹر" کو بھی مٹا دیا گیا تھا۔

www.taemeernews.com

ماسٹر صاحب غصے میں بھرے ہوئے جب ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو اُن کے جوتے کی کیل ان کے پاؤں میں اودنیا؟ گڑ رہی تھی۔ پاؤں میں سخت درد ہو رہا تھا۔ لیکن اس وقت وہ جسمانی تکلیف محسوس نہیں کر رہے تھے۔ جب انسان کا دل دکھی ہوتا ہے تو وہ جسمانی تکلیفوں کو بھول جاتا ہے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کے پاس پہنچے تو ان کے کان میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی آواز پڑی۔ وہ چپراسی کو کہہ رہے تھے ــــ " جاؤ یو ماسٹر کو بلا لاؤ "

یو ماسٹر۔ یو ماسٹر۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے یہ الفاظ ان کے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگے۔ وہ اس چوٹ کو برداشت نہ کر سکے۔ جس ذمہ دار آدمی کے پاس وہ رپورٹ کرنے کے لئے آئے تھے وہی ان کو اصلی نام سے نہیں پکارتا تو پھر ان کی شکایت کو کون سنے گا۔ وہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے چک اٹھا کر کمرے کے اندر داخل ہو گئے۔ اور جاتے ہی بولنا شروع کیا۔

" جناب آپ میری عزت نہیں کرتے تو اور کون کرے گا۔ لڑکوں کی بات تو دور کی رہی۔ ماسٹر بھی مجھے یو ماسٹر کہنے لگے ہیں ــــ اور آپ بھی ــــ اور اگر میری عزت نہیں ہے تو نوکری کرنے سے فائدہ ؟ میں نوکری کرنے آتا ہوں مذاق اڑوانے نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی میز سے ایک کاغذ لیتے ہوئے جلدی جلدی اپنا استعفی لکھا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے سامنے پھینکتے ہوئے بولے۔

" میں اس نوکری پر لعنت بھیجتا ہوں۔" اور کمرے سے باہر کی طرف چل دیئے،

www.taemeernews.com

ہیڈ ماسٹر صاحب ہکے بکے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ آج یوماسٹر کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ اُسے یُوماسٹر کہتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ ان کی عزت نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے وہ فوراً ان کے پیچھے پیچھے آئے۔ کچھ اور ماسٹروں کو بھی معاملے کی نزاکت کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ بھی اکٹھے ہو گئے یوماسٹر کو ہزارہ منانے کی کوشش کی۔ لیکن غصے سے بھرا ہوا انسان کب مانتا ہے اور خاص طور سے وہ۔ جسے عام طور پر غصہ آتا ہی کم ہو وہ استعفیٰ واپس لینے پر تیار نہ ہوئے اور گھر کی طرف چل دیئے اس حالت میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی زیادہ کہنا مناسب نہ سمجھا لیکن ایک ماسٹر کو اشارے سے یوماسٹر کے ساتھ کر دیا وہ ان کے ساتھ گھر تک گئے۔ کافی سمجھایا۔ بجھایا لیکن فائدہ کچھ نہ ہوا۔ وہ صرف ایک ہی بات پر اڑے ہوئے تھے۔

"جہاں عزت نہیں وہاں نوکری کرنے سے فائدہ۔ ایسی نوکریاں مجھے ہزار مل سکتی ہیں"

پرائیویٹ اسکول تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سنجیدہ آدمی تھے۔ اور اپنی غلطی پر نادم بھی۔ شام کو خود یوماسٹر کے گھر گئے لیکن پتہ چلا کہ وہ تو سہ پہر کی گاڑی سے اپنے گاؤں چلے گئے ہیں۔ بیوی بچوں کو ساتھ لے کر۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو سخت مایوسی ہوئی۔ ایک اچھا ٹیچر جس کے کلاس کا نتیجہ ہمیشہ دوسرے کلاسوں سے اچھا رہتا تھا۔ ان سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔ اس بات کا انھیں افسوس تھا۔ آخر انھوں نے کچھ دنوں کے لئے استعفیٰ کو روک رکھا۔ اور سوچا کچھ دنوں بعد جب ہزارہ سنگھ کا غصہ اتر جائے گا تو پھر انھیں منا کر لے آؤں گا۔

ماسٹر ہزارہ سنگھ گاؤں میں آئے تو سبھی لوگ ان سے ملنے اور حال پوچھنے آئے

www.taemeernews.com

"کہو ہزارہ سنگھ کیا حال ہے کتنی چھٹی آئے"؟

"ہزارہ میاں۔ ہیڈ ماسٹر بنے کے نہیں ابھی"؟

"ہزارہ سوں مزے میں ہے۔ بھائی۔ لڑکوں کو پڑھا آئے اور بس۔ ہماری طرح دن رات مٹی کے ساتھ مٹی تو نہیں ہونا پڑتا"۔

یہ سن کر ہزارہ سنگھ کو بہت خوشی ہوئی۔ جب لوگ انھیں ہزارہ سنگھ کہہ کر پکارتے تو انھیں یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز انھیں مل گئی ہو اب انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اسکول نہیں جاؤں گا۔ یہاں اپنی کھیتی کا کام سنبھالوں گا۔ آخر ٹیاڑ ہو کر بھی تو یہ کام کرنا ہی ہے یا نہ ہوگا تو کسی قریبی اسکول میں نوکری کر لوں گا۔ یہاں اور نہیں تو کم از کم عزت تو ہے۔ عزت کی آدھی روٹی بھی اچھی

دن بیتنے لگے وہ صبح کو اپنے کھیتوں کی طرف سیر کرنے کو نکل جاتے۔ باہر ہی رہٹ پر ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے۔ رہٹ کی چیں چیں کی آواز لطیف نغمے کی طرح ان کے کانوں میں پڑتی تو وہ جھومنے لگتے واپس آکر ناشتہ کرتے۔ کچھ دیر آرام کرتے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد وہ چوپال میں جا بیٹھتے۔ بہت سے گاؤں والے ان سے شہر کے بارے میں طرح طرح کے سوال کرتے اور ہر دفعہ انھیں ہزارہ سنگھ کہہ کر پکارتے۔ اس سے ان کو شروع شروع میں خوشی ضرور ہوئی لیکن تب بھی کچھ دنوں بعد وہ کچھ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ وہ اس اداسی کی وجہ محسوس نہیں کر پا رہے تھے لیکن تب بھی انھیں ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کی کوئی بہت ہی قیمتی چیز کھو گئی ہے۔

ایک دن چوپال میں وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ کہ انھیں سپنا آیا انھوں نے دیکھا کہ وہ کسی انجانے راستے پر چلے جا رہے ہیں۔ یکایک دور انھیں کوئی چمکتی

www.taemeernews.com

ہوئی چیز دکھائی دی۔ قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک ہیرا چمک رہا تھا۔ لیکن جونہی وہ ہیرے کے بالکل قریب پہنچے تو وہ سرک کر دور چلا گیا۔ وہ پھر تیز قدموں سے اس ہیرے کے پاس پہنچے۔ تو پھر پھسل کر دور نکل گیا۔ یہاں تک کہ وہ تھک گئے۔ لیکن انھوں نے کوشش جاری رکھی۔ آخر ایک دفعہ ہیرا وہیں پڑا رہا۔ وہ اُسے جھک کر اٹھانے لگے۔ تو یک بارگی ان کی آنکھ کھل گئی

کچھ دنوں بعد سکول میں دسہرے کی چھٹیاں ہوگئیں۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب ہزارہ سنگھ سے ملنے کے لئے آگئے۔ وہ دو تین دن تک ان کے ہاں رہے اور انھیں لے کر بلّے آگئے۔ اسکول بند ہونے سے پہلے انھوں نے سب لڑکوں اور لڑکوں سے کہہ دیا تھا کہ کسی نے ماسٹر ہزارہ سنگھ کو "یو ماسٹر" کہا تو اچھا نہ ہوگا۔

چھٹیوں کے بعد سکول کھلے۔ ہزارہ سنگھ صاحب نے اسکول جانا شروع کر دیا وہ چپ چاپ کلاس جاتے اور پڑھا کر لوٹ آتے۔ ماسٹر بھی انھیں سردار ہزارہ سنگھ کہہ کر پکارنے لگے۔ کچھ دن تک تو ٹھیک رہا لیکن پھر وہ اداس رہنے لگے۔ اس اداسی کی وجہ انھیں خود نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ اس سے وہ پریشان بھی رہنے لگے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ انھوں نے لڑکوں کو سزا دینا شروع کر دی۔ جس لڑکے کو ذرا سا سبق بھول جاتا۔ وہ اسے بنچ پر کھڑا کر دیتے۔ اگر اسے دوبارہ سبق نہ آتا تو ایک دو روں بھی مار دیتے۔ لڑکے ان کی اس تبدیلی کی وجہ کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اس سے پہلے تو وہ کبھی کسی کو سزا نہیں دیتے تھے۔ ایک ایک سبق تین تین چار چار دفعہ پڑھا دیا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ پڑھائے ہوئے سبق کو دوبارہ پڑھانے کا نام تک

www.taemeernews.com

نہیں لیتے تھے۔

اسی طرح تقریباً ایک مہینہ گزر گیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی لگائی ہوئی سختی کو اب لوگ بھولنے لگے تھے۔

ایک دن جب ہزارہ سنگھ صاحب کلاس میں گئے تو پھر پہلے کی طرح بلیک بورڈ پر جلی حروف میں "یو ماسٹر" لکھا ہوا ملا۔

"یو ماسٹر" لڑکے یہ شرارت کر تو بیٹھے تھے لیکن اب سزا ملنے کے ڈر سے دل ہی دل میں خوفزدہ بھی تھے۔ ادھ کھلی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ اب کیا ہوتا ہے۔ ماسٹر صاحب نے ایک نظر بلیک بورڈ کی طرف دیکھا پہلے تھوڑی سی جھنجھلاہٹ ان کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ چند لمحوں کے بعد ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی جسے چھپانے کے لئے انھوں نے اپنے منھ کے آگے کتاب کھول لی۔ لڑکوں نے ان کی مسکراہٹ کو دیکھ لیا تھا۔ اس سے ان کی جان میں جان آئی۔

ماسٹر ہزارہ سنگھ نے بلیک بورڈ پر لکھے ہوئے "یو ماسٹر" کو بھی نہیں مٹایا اور پڑھانا شروع کر دیا۔ اس دن سے انھوں نے لڑکوں کو سزا دینا بھی بند کر دیا ہے۔ اب پھر وہ انھیں ایک سبق کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھا دیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

نقلی اور اصلی

گرمیوں کی وہ چاندنی رات بہت خوبصورت تھی۔
اس رات کا پہلا پہر میں نے کروٹیں بدلتے اور تین مہینے سے مائیکے گئی ہوئی بیوی کو یاد کرتے ہوئے بتایا تھا۔ اور جب نیند آئی تب بھی رات کا باقی حصہ بیوی کے ہی سپنے دیکھتے ہوئے گزرا۔

صبح اٹھا تو رات کو دیر تک جلتے رہنے کی وجہ سے طبیعت بھاری بھاری سی تھی۔ کچھ تھکاوٹ بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس پر بھی صبح کی ٹھنڈی سہاونی ہوا جسم و جان کو بھلی لگ رہی تھی۔ اس لئے چھت پر ٹہلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد باہر کھیتوں کی طرف سیر کرنے جانے کے لئے سیڑھیوں کی طرف مڑا ہی تھا کہ بغل والے فلیٹ کی چھت پر ایک اجنبی لڑکی چارپائی پر بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ ہو بہو میری بیوی سے ملتی ہوئی۔ سانولے رنگ کی دبلی پتلی لڑکی۔ سفید قمیض اور شلوار پہنے ہوئے گلے میں سفید رنگ کا ڈوپٹہ۔ کالے لمبے کھلے بال اس کی

www.taemeernews.com

پیٹھ پر لہرا رہے تھے۔ اپنی بیوی سے اس کی اتنی مشابہت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اور کافی دیر تک کھویا ہوا سا اسے دیکھتا رہا۔

اچانک وہ انگڑائی لیتی ہوئی اٹھی اور اپنے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھنے لگی۔ میں اب بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے بالکل میری بیوی کے ہی انداز میں پیچھے کی طرف ڈھیلا سا جوڑا باندھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر ذرا سا سنبھلی۔ ڈوپٹے کو ٹھیک کیا اور صراحی سے گلاس میں پانی انڈیل کر تھوڑا تھوڑا کر کے پینے لگی۔ میری بیوی کو بھی ٹھیک اسی طرح صبح کے وقت باسی پانی پینے کی عادت ہے۔ اسی وقت میری پڑوسن چھت پر آ گئی۔

"لیلا۔ بیٹی جاگ گئی؟" اس نے میری بیوی کی ہم شکل لڑکی سے کہا "لیلا" ——— صورت شکل سے تو وہ میری بیوی سے ملتی ہی تھی۔ اب مجھے پتہ چلا کہ اس کا نام بھی میری بیوی سے کس قدر ملتا جلتا ہے۔ شیلا اور لیلا میں فرق ہی کتنا ہے؟

"ہاں۔ موسی! ابھی ابھی سو کر اٹھی ہوں۔ اس کی باریک اور میٹھی آواز نے مجھے اور بھی چونکا دیا۔ اس کی آواز بھی میری بیوی سے ملتی جلتی تھی۔

اُسی وقت دھڑام کی آواز ہوئی اور میرا دھیان اس طرف گیا۔ بندر نے میری پانی کی صراحی کو فرش پر گرا دیا تھا۔ صراحی کے گرنے کی آواز میری پڑوسن اور اس نئی لڑکی نے بھی سن لی تھی

www.taemeernews.com

اب وہ دونوں بندر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جو وہاں سے ہٹ کر سیڑھیوں کی چھت پر جا بیٹھا تھا۔

"بندر بہت پریشان کرنے لگے ہیں آج کل"۔ میری پڑوسن نزدیک آ کر مجھ سے کہنے لگی۔ "ابھی اس دن میری دوائی کی شیشی اٹھا کر لے گئے تھے"۔

"جی! صراحی کی تو خیر کوئی بات نہیں۔ مگر پینے کو اب ٹھنڈا پانی نہیں ملے گا۔ نل کا گرم پانی پینا پڑے گا"۔

"ابھی پینا ہو تو میں اپنی صراحی سے بھر دوں"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے لیلا کو آواز دی۔

میں نہار منہ پانی نہیں پیتا۔ لیکن اس خیال سے کہ شاید لیلا پانی لے کر آئے اور اس طرح اسے اور قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملے میں نے سر ہلایا ـــــ جی ہاں۔ میں جب تک نہار منہ دو گلاس پانی نہ پی لوں، چین نہیں آتا"۔

"لیلا! میری پڑوسن نے اسے پھر آواز دی۔ "صراحی سے پانی کا گلاس بھر کر لیتی آ بیٹی"۔

"شیلا مائیکے سے کب آئے گی"؟ میری پڑوسن نے مجھ سے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا میں نے دیکھا۔ لیلا پانی کا گلاس لئے چلی آ رہی تھی۔ اس کے چلنے کا انداز۔ گلاس کے پکڑنے کا انداز سب میری بیوی سے ملتا جلتا تھا۔ وہ ہمارے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

www.taemeernews.com

—— پڑوسن نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر مجھے دے دیا۔ کبھی عادت نہ ہونے کی وجہ سے پہلے تو پانی خالی چھاتی میں جا کر ٹھنڈا ٹھنڈا لگا لیکن پھر میں غٹ غٹ پی گیا۔

"اور"۔ لیلا نے مجھ سے سوال کیا۔ پانی کی مجھے ضرورت نہیں تھی ایک گلاس ہی بڑی مشکل سے ختم کیا تھا۔ لیکن ابھی میں لیلا کو اور دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے کہہ دیا "ہاں"۔ ایک گلاس اور۔ پانی خوب ٹھنڈا ہے" "ابھی صراحی نئی ہے"۔ میری پڑوسن نے کہا "لیلا اپنے ساتھ لائی ہے اسے بھی نہار منہ ٹھنڈا پانی پینے کی عادت ہے —" شیلا کب آئے گی"؟ میری پڑوسن نے پھر سوال دھرایا "اب تو اسے گئے تین مہینے ہو رہے ہیں" "جی ہاں اب آنے ہی والی ہے۔ اپنے اگلے خط میں آنے کی ٹھیک تاریخ لکھے گی"۔

لیلا پانی لے کر آ گئی تھی۔ اس بار اسی نے میری طرف پانی کا گلاس بڑھایا میں نے اب کی اسے اور بڑی غور سے دیکھا۔ اس کے نین نقش۔ بال۔ کان۔ یہاں تک کہ کانوں کی بالیوں سے لے کر ہاتھوں کی چوڑیوں کے رنگ تک سب کچھ اپنی بیوی سے ملتا جلتا دکھائی دیا۔ جب میری پڑوسن اور لیلا چلی گئیں تب بھی میں انہی کی طرف دیکھتا رہا۔

اس دن دفتر میں بھی میں دن بھر لیلا کے بارے میں یہی سوچتا رہا کہ میری بیوی سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ اس طرح ہر روز صبح و شام کو لیلا کو چھت پر دیکھنے کا موقعہ ملتا اور ہر روز لیلا کی کوئی نہ کوئی بات

www.taemeernews.com

مجھے شیلا سے ملتی ہوئی محسوس ہوتی۔

سنیچر کی رات کو شیلا بھی مائیکے سے لوٹ آئی۔ اتوار کی صبح کو اس کے آنے کی خبر پھیلتے ہی اس سے ملنے کے لئے پاس پڑوس کی سبھی عورتیں آئیں۔ لیلا بھی اپنی موسی کے ساتھ چلی آئی تھی۔

اب میں نے شیلا اور لیلا کو پاس پاس کھڑے دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کس طرح میں اتنے دنوں تک متواتر دھوکا کھاتا رہا ـــــ لیلا کی شکل کسی طرح بھی شیلا سے نہیں مل رہی تھی۔ نہ ناک۔ نہ بال نہ قد اور نہ رنگ۔

"موسی چلو دیر ہو رہی ہے۔" لیلا نے پڑوسن سے کہا۔

اب مجھے پتہ چلا کہ اس کی آواز بھی شیلا سے بالکل مختلف تھی بالکل مختلف ـــــ

www.taemeernews.com

خدا نہیں آتا

پہاڑ کی گود میں بسے اس گاؤں کی ریت بڑی نرالی ہے۔ جب کبھی آندھی یا طوفان آتا ہے۔ گاؤں کے کنوارے نوجوان اپنے خدا کی تلاش میں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ پہاڑ کی وہ چوٹی ہے۔ جس پر ہزاروں سالوں کی کوشش کے باوجود وہ ایک بار بھی نہیں پہنچ پائے لیکن اس کے باوجود کوشش ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

ایک عقیدے کے مطابق جب آندھی یا طوفان آتا ہے۔ اس وقت ان کا وہ خدا پہاڑ کی آخری چوٹی پر اپنی بھیڑوں کو طوفان سے بچانے کے لئے نکلتا ہے۔ اور اس طوفان میں لوگ اسے ایک ایک بھیڑ کو ہانک کر چوٹی پر ہی کسی بہت بڑی چٹان کے نیچے محفوظ جگہ پر پہنچاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ بس اسی خدا کو اس گاؤں والے اپنے گاؤں میں واپس لانا چاہتے ہیں کیونکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ خدا

www.taemeernews.com

ہزاروں سال پہلے اسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ ایک دن وہ اپنی بھیڑوں کو پہاڑ پر چرانے لے گیا تو لوگ کہتے ہیں اس دن بہت بھیانک طوفان آیا۔ اتنا بھیانک کہ گاؤں کی ساری جھونپڑیاں ہوا کے زور سے اڑ کر بکھر گئیں۔ کتنے ہی لمبے لمبے پیڑ آن کی آن میں گر کر ڈھیر ہو گئے۔ پہاڑ کی چوٹی سے بڑی بڑی چٹانیں ذروں کی طرح اڑتی ہوئی زمین پر آ کر خاک ہو گئیں۔

اب ان میں سے ایک چٹان اتنی بڑی تھی کہ اس نے گاؤں کی گود میں بہنے والی ندی کا رخ ہی موڑ دیا۔ پہلے وہ گاؤں سے ایک فرلانگ دور تھی اور پھر اس چٹان نے جو ندی کا راستہ کاٹا تو گاؤں کے بالکل قریب آ گئی۔ بلکہ گاؤں والے تو یہ تک کہتے ہیں کہ ندی کا رخ بھلا کون موڑ سکتا تھا۔ وہ تو اس خدا کی مہربانی ہے۔ اسے گاؤں والوں کی تکلیف کا اندازہ تھا۔ اس لئے اتنا بڑا طوفان وہ خود ہی لایا اور اس بہانے اتنی بڑی چٹان گرا کر وہ ندی کو گاؤں والوں کے قریب لے آیا۔

جب سے وہ طوفان آیا ہے۔ تب سے وہ خدا اپنی بھیڑوں کو لے کر اس پہاڑ کی چوٹی پر مقیم ہے اور وہیں اپنی بھیڑیں چراتا ہے۔

بس اسی خدا کو زمین پر اتارنے کے لئے گاؤں کے کنوارے نوجوان آندھی طوفان میں نکل پڑتے ہیں۔ طوفان جس قدر تیز ہوتا ہے۔ اس سے دگنا ان کا جوش ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com

پاؤں پھسل رہے ہیں۔ قدم اکھڑ رہے ہیں، سانس پھول رہا ہے لیکن ان کی نظریں طوفان میں گھری ہوئی دس چوٹی کی طرف جمی ہوئی ہیں اور وہ والہانہ اس کی طرف بڑھتے رہتے ہیں اس کوشش میں ہر سال دو تین جوان اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ کہیں کوئی سہارا چھوٹا، کوئی قدم ڈگمگایا اور لڑھکتے ہوئے اپنے ہی خون میں نہا گئے۔

ایسے موقعوں پر جب پتھر پر اس نوجوان کی لاش آکر ٹکتی ہے خون سے لتھ پتھ اس پتھر کو سارا گاؤں اپنی پیشانی سے چھو کر نمسکار کرتا ہے۔ اور پھر اسے تراش کر اس مندر میں لگا دیا جاتا ہے جو وہ اپنے خدا کے لئے بنا رہے ہیں، یہ سلسلہ ہزاروں سالوں سے چلا آرہا ہے۔ ہر سال دو تین نوجوان شہید ہو جاتے ہیں اور ہر سال مندر کی دیواروں پر دو تین پتھروں کا اضافہ ہوتا ہے اس طرح وہ اپنے خدا کے لئے ایک بہت بڑا مندر بنا چکے ہیں۔ جس میں انھوں نے اس کے لئے پتھر کا ہی آسن بھی بنا رکھا ہے۔ جب یہ بیٹھ کر پالیٹ کر ان کا خدا آرام کرے گا۔ وہ خدا جو ان کے لئے ندی کو گاؤں کے قریب لے آیا ہے۔ وہ خدا جو طوفان میں گھری معصوم بھیڑوں کو ہانک کر محفوظ جگہ پر پہنچاتا ہے۔ وہ خدا اگر پہاڑ کی بلند چوٹی سے اتر کر ان کے بنائے ہوئے مندر میں آجائے تو وہ ان کی اپنی بھیڑوں کی طرح حفاظت کرے گا۔ ان کی زندگیوں میں

www.taemeernews.com

خوشیاں بھر دے گا۔ ایسا انھیں یقین ہے۔

اسی لئے وہ اپنے خدا کے لئے جو مندر بنا رہے ہیں اس کے ایک ایک پتھر کے لئے انھوں نے اپنے خون کی قربانی دی ہے۔ ہزاروں سالوں سے وہ یہ قربانی صرف اس امید پر کر رہے ہیں کہ خدا آئے گا اور ان کی دنیا کو ان کی زندگیوں کو مسرتوں سے بھر دے گا۔

اور وہ خدا ہزاروں سالوں سے اس چوٹی پر مقیم ہے مصیبت میں گھری بھیڑوں کی حفاظت تو کرتا ہے لیکن ان کے گاؤں میں نہیں آتا۔

اور اس گاؤں سے چند میل کے فاصلے پر تارکول کی جو سڑک بنی ہے اور جس کے ساتھ ساتھ بجلی کے کھمبوں کی جو قطار گئی ہے اس سڑک پر اور ان تاروں میں رواں دواں زندگی کتنی آگے بڑھ گئی ہے۔ زندگی کی کتنی خوشیاں اس گاؤں والوں کو ہزاروں سال پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔ اس بات کا احساس گاؤں والوں کو نہیں ہے۔

ہو بھی کیسے؟ ان کا خدا تو پہاڑ کی چوٹی پر مقیم ہے۔ وہ نیچے اترتا ہی نہیں۔

www.taemeernews.com

بدبو

مجھے اس ماحول سے بدبو آرہی تھی۔

عجیب طرح کے لوگ وہاں جمع تھے۔ ایک طرف پانچ چھ آدمی گھٹنوں کے بل بیٹھے چرس کے شغل میں مصروف تھے۔ اور چرس کے دھوئیں کی بدبو سے فضا بوجھل ہو رہی تھی۔ ان کے پاس ہی چت پٹ کے کھیل سے جوا چل رہا تھا۔ ایک دوسرے کونے میں پندرہ بیس لوفر قسم کے لوگ دو تین آوارہ لڑکیوں سے چہل کر رہے تھے۔ وہ کونہ شراب اور سگرٹوں کی ملی جلی بو سے لدا ہوا تھا۔ لڑکیاں بھدے اور بے سرے انداز میں ناچ رہی تھیں۔ گا رہی تھیں۔ اور ان کے ایک ایک تال۔ ایک ایک تان اور مُرکی پر ایسی واہ واہ اور لے دے ہو رہی تھی کہ ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ ایک اور ٹولی بھنگ کا نشہ بنانے کے کام میں مصروف تھی اور اُس کے گرد بھنگیڑیوں کا ایک گروہ

www.taemeernews.com

اس طرح جمع تھا جیسے ہون کے گرد پجاری بڑی عقیدت سے بیٹھے ہوں۔
ان کی گفتگو سننے کے بعد اندازہ ہوا کہ ان میں قاتل بھی تھے۔ چور اُچکے بھی۔ جیب کترے اور رجلیے۔ غرضیکہ عرف عام میں اچھی خاصی چنڈال چوکڑی جمع تھی

اس بدبودار ماحول میں پہنچ کر مجھے یہ بھی تعجب ہو رہا تھا کہ میں اس جگہ کیسے پہنچ گیا ہوں۔ اور مجھے لگا جیسے اس جگہ میں کوئی مقناطیسی کشش ہو جس نے مجھے اپنے قریب دیکھ کر اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ میں وہاں سے جلد از جلد باہر آنا چاہتا تھا کیونکہ میرا اس ماحول میں دم گھٹ رہا تھا۔ میرے تصور میں ان لوگوں کے بتائے ہوئے وہ تمام پریشان لوگ تھے۔ جو جیب کٹنے کا احساس ہوتے ہی حواس باختہ ہو گئے تھے، یا رات کو بھرے ہوئے گھروں میں سوئے اور صبح جاگے تو گھر میں جھاڑو پھر گیا تھا۔ آنِ واحد میں کنگال ہو گئے تھے یا وہ معصوم اور الہڑ عورتیں تھیں جن کی ان لوگوں نے عصمت دری کی تھی یا پھر ہمیشہ کے لئے عصمت بیچنے کے لئے مجبور ہو گئیں تھیں۔ یا پھر وہ لاشیں تھیں جو انجانی جگہوں پر پڑی ہیں۔ ٹھنڈی ہو گئیں، اور پھر وہیں گل سڑ گئیں۔ اور دور دور تک ان کی بدبو فضا میں پھیل گئی

میں نے اپنی ناک رومال سے بند کر لی جیسے ان لاشوں کی بدبو میری ناک میں گھسی آ رہی ہو۔ جیسے میں غلطی سے ان زندہ لوگوں کے بیچ نہیں بلکہ لاشوں کے بیچ پہنچ گیا تھا۔

www.taemeernews.com

تبھی مجھے احساس ہوا کہ میں نے بھی دو تین مرتبہ کچھ عورتوں کی عصمت لینے کی کوشش کی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ کسی عورت کی ہوشیاری یا اپنی نااہلی کی وجہ سے میں اپنی کوششوں میں ناکام رہا۔ اگر میں بھی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا ہوتا تو ہوسکتا ہے کہ میں بھی اس وقت ایک معزز آدمی ہونے کے بجائے اپنے جرم کی سزا کے طور پر جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہوتا۔ یا پھر انہی لوگوں کے بیچ کسی ٹولی میں بیٹھا انہی میں سے ایک ہو گیا ہوتا۔

اس خیال کے آتے ہی میں ان سب ٹولیوں کو ایک نظر دوبارہ دیکھتے ہوئے اندازہ لگانے لگا کہ میں ان میں سے کہاں کہاں ہوسکتا تھا چرس والی ٹولی میں۔ بھنگ والی ٹولی میں، جوئے بازوں کے پاس یا ہر جگہ اگر ایسا ہو جاتا تو میری بدبو بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاتی اور یہ ماحول اور زیادہ بدبودار اور گھناؤنا ہو جاتا۔

بدبو کے تصور سے میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی ناک پر رومال رکھا تو دیکھا کہ وہ سب لوگ گھوم گھوم کر میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے انکا سارا وجود ناک بن گیا ہو اور وہ سونگھ سونگھ کر دیکھ رہے ہوں کہ انکے بیچ یہ بدبودار چیز کہاں سے آگئی مجھے ڈر لگنے لگا کہ کہیں وہ میرے اندر کی بدبو کو سونگھ نہ لیں اور انھیں مجھ سے گھن نہ آنے لگے۔ اسی لئے میں الٹے پاؤں وہاں سے لوٹ آیا۔

باہر آتے ہی مجھے مسرت ہو رہی تھی کہ میں نے وہاں سے باہر نکل کر وہاں کی بدبو کو کسی حد تک تو کم کیا ہی ہے۔

www.taemeernews.com

صرف ایک آدمی کا درد

تب بڑا ہی بھینکرا کال پڑا تھا۔ ایسا خطرناک اور ڈراونا کہ جس کا تصور موت کا تصور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے موت دوزخ کی ساری مصیبتیں لے کر آسمانوں سے اتری اور زمین کے چپے چپے پر پھیل گئی۔ ہواؤں میں جیسے زہر گھل گیا۔ فضاؤں سے آگ برسنے لگی اور موت ناگن بن کر پھنکارتی ہوئی زندگی کو ڈسنے لگی۔

جب بارش نہیں ہوئی اور سوکھا پڑا تو نہ صرف یہ ہوا کہ لوگوں کے کھیت سوکھ گئے۔ کھیتوں کو پانی دینے والے کنوئیں اور تالاب سوکھ گئے۔ ندیاں نالے سوکھ گئے بلکہ یہ بھی ہوا کہ جنگلوں میں گرمی کی وجہ سے آگ لگ گئی اور ہر طرح کے جاندار اس آگ میں جل کر راکھ ہونے لگے جو باہر نکل کر بھاگے۔ انھوں نے بھوک اور پیاس کے مارے دم توڑ دیا

اسی لئے صرف یہ نہیں کہ خاندان کے خاندان مٹ گئے بلکہ بڑے بڑے قبیلے نیست و نابود ہو گئے۔ پوری پوری نسلیں ختم ہو گئیں۔ یہاں تک

www.taemeernews.com

کہ لوگوں نے سمجھا کہ شاید قیامت آگئی۔ سورج سوا نیزے پر چمکنے والا ہے اور زندگی کا وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹنے والا ہے۔

ایسی حالت میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ لوگ کہتے ہیں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے پہلے تو انسانوں نے ایک دوسرے کو لوٹ کر کھایا۔ قتل ہوئے اور پھر پتہ نہیں کہاں تک سچ ہے۔ لوگ کہتے ہیں انسانوں نے انسانوں کو کھانا شروع کر دیا۔ لیکن پھر بھی بچ نہ سکے۔ موت دو چار روز بعد آئی اور ان کے لہو کو زبان سے چاٹتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اکال میں بھوک اور پیاس سے تو لوگوں کو مرنا ہی تھا لیکن انسانوں نے اپنی جان بچانے کے لئے جب دوسرے انسانوں کو مار کے کھانے کا سلسلہ شروع کیا تو جیسے موت کا کام اور آسان ہو گیا۔ زندگی کو ختم کرنے کے لئے جب خود زندگی نے ہتھیار اٹھا لئے تو موت ایک تماش بین کی طرح ایک کونے میں کھڑی ہو کر تماشہ دیکھنے لگی۔

ایسی اندوہناک حالت جس میں زندگی اندھی ہو کر خود ہی موت کے سمندر میں ڈوب رہی تھی۔ لوگ کہتے ہیں صرف ایک آدمی ایسا بچا تھا جس نے چاروں طرف پھیلے ہوئے موت کے وجود کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے سامنے اس کے خاندان کے سارے افراد ایک ایک کر کے مر گئے۔ پانی کا ایسا اکال تھا کہ ان کے مرنے پر اس کی آنکھیں بھی جیسے پتھرا گئیں اور ان سے آنسوؤں کی ایک بوند بھی نہ ٹپک سکی۔ لیکن اس پر بھی اس نے صفحۂ ہستی پر موت کی حکومت کو تسلیم

www.taemeernews.com

کرنے سے انکار کر دیا۔ جب بھی اس کے خاندان کا یا اس کے قبیلے کا کوئی فرد بھوک پیاس کی تاب نہ لا کر دم توڑتا تو وہ سوا نیزے پر چمک رہے سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا "جتنی مرضی آگ برسا لو۔ لیکن تم صفحہ ہستی سے زندگی کا وجود مٹا نہیں سکتے"۔ وہ نیلے آسمان کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتا اور کہتا "جتنا مرضی ہو ستم ڈھا لو لیکن زندگی زندہ رہے گی"۔

اور یہ کہتے ہوئے وہ اپنا ٹوٹا ہوا مٹی کا برتن لے کر پانی کی تلاش میں نکل پڑتا۔ اس تلاش میں اسے اپنی جان کی بھی حفاظت کرنی ہوتی تھی۔

بہت کوشش کے بعد اپنے کھیت سے میلوں دور ایک سوکھی ہوئی ندی کے پاٹ میں گہری کھدائی کرنے کے بعد آخر اسے گوہر نایاب مل ہی گیا۔ پانی کیا تھا۔ ننھے ننھے قطرے تھے جن کو اس نے بڑی محنت سے آہستہ آہستہ اپنے برتن میں قیمتی موتیوں کی طرح سمیٹا۔ جیسے جیسے برتن میں پانی بھرنے لگا۔ ویسے ویسے اس کے ہونٹوں کی پیاس بھی بڑھنے لگی لیکن اپنی پیاس سے زیادہ اسے اپنے کھیت کی پیاس کی فکر تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا: جیسے دھرتی ماں پیاس کے مارے بلک رہی ہے اور اپنی آنکھوں میں بڑی مشکل سے زندگی کی لو کو روشن کئے ہے۔ اس کے ہونٹ

www.taemeernews.com

پیاس کے مارے کبھی کھلتے ہیں کبھی بند ہوتے ہیں۔ اس لئے اپنے سوکھے ہونٹوں کو جب اس نے پانی کے دو قطروں سے گیلا کیا تو اسے احساس ہوا جیسے ماں کی پیاس بجھائے بغیر وہ بہت بڑا گناہ کر رہا ہو۔

اس طرح اپنی پیاس کو مار کر اس پرتن میں زندگی بند کر کے ہزار مشکلوں کا سامنا کرنے کے بعد وہ اپنے کھیت میں پہنچا اور وہاں بڑی عقیدت سے ماں کے پیاسے ہونٹوں میں اس نے امرت انڈیل دیا۔ اور پھر انہی قدموں سے واپس اسی دریا کی طرف چل پڑا۔ جہاں سے اسے زندگی کا ایک کن، صرف ایک کن حاصل ہونے کی امید ہو گئی تھی۔

اس طرح یہ سلسلہ کتنے دنوں چلتا رہا۔ وہ میلوں کا فاصلہ طے کر کے چھوٹے سے برتن میں پانی سمیٹتا اور چلو دو چلو جتنا بھی کھیت تک پہنچ پاتا۔ اسے اپنے کھیت کے منہ میں ڈالتا۔ اور اس سے پیشتر کہ سورج ہنستا ہوا اس کے کھیت کے منہ سے وہ پانی خشک کرے۔ وہ اپنے پیالے کو دوبارہ بھرنے کے لئے اپنے سفر پر چل دیتا۔

پھر یہ ہوا کہ آخری بار جب وہ پانی کا پیالہ لے کر اپنے پیاسے کھیت میں لوٹا تو زمین پر پانی گرانے کے ساتھ ہی کمزوری اور تھکاوٹ کی وجہ سے اس کی ٹانگوں میں لغزش ہوئی۔ اس کے ہاتھ کانپنے

www.taemeernews.com

اور وہ سوکھے پیڑ کی مانند زمین پر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ مٹی کا پیالہ جو اس کی آخری امید تھی ایک طرف گر کر چکنا چور ہو گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے موت ناچنے لگی۔

اس نے اپنی آخری گھڑی آئی دیکھ کر اپنے وجود کی رہی سہی طاقت کو سمیٹا اور اس کی آنکھوں سے دو ننھے ننھے آنسو نکلے اور کھیت کو سیراب کر گئے۔

یہ اس ایک آدمی کا درد تھا۔ جس کے آنسوؤں کو دیکھ کر سورج کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں اور موتیوں کی طرح دو آنسو سورج کی آنکھوں سے ڈھلک پڑے۔ اسی لمحے ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ زمین کے چپے چپے کی پیاس آن واحد میں مٹ گئی اور زندگی ایک مرتبہ پھر مسکرانے لگی۔

---

www.taemeernews.com

دشمن تو پہچانو

ہمیں ہندوستان دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ اس لئے میں اور میرے ساتھی سبھی بہت خوش ہیں۔"

یہ جملہ تھا ایک غیر ملکی ثقافتی وفد کے لیڈر کا جو کراچی کے ہوائی اڈے پر پی۔ آئی۔ اے کے جہاز سے ابھی ابھی اترا تھا۔ اور اس وقت اپنے استقبال کے لئے آئے ہوئے پاکستانی افسران سے اپنے وفد کے ممبران کا تعارف کرا رہا تھا۔

پاکستان کے افسران کے لیڈر کے چہرے پر کچھ حیرانی سی ابھری اور کچھ شرمندگی بھی اور اس نے اپنے مہمان کو حقیقت سے واقف کراتے ہوئے کہا۔ "جناب۔ آپ اس وقت پاکستان میں ہیں۔"

"اوہ معاف کیجئے گا۔ میرا مطلب پاکستان سے ہی تھا ہم ایک مدت سے آپ کا ملک دیکھنے کے خواہاں تھے۔ یہاں کے عوام سے ملنے کے متمنی تھے۔

www.taemeernews.com

بات آئی گئی ہوگئی۔

پھر اس وفد نے کراچی کی بہت سی جگہیں دیکھیں۔ بندرگاہ سکریٹریٹ۔ حبیب بینک۔ پیر الٰہی بخش کالونی۔ بندر روڈ۔ مہاتما گاندھی پارک۔ اور سب دیکھ کر وفد کے لیڈر نے کہا: "جتنی تعریف سنتے آئے تھے آپ کا ملک ہندوستان تو اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔"

کسی پاکستانی نے انھیں پھر یاد دلایا: "جناب یہ پاکستان ہے"

او معاف کیجئے گا۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں۔ میرا مطلب دراصل ہندوستان او معاف کیجئے گا پاکستان سے ہی تھا۔"

حبیب بینک کے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس وفد کے ممبر خاص طور سے رکے۔ وہاں ایک جیوتشی آنتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی بانس کی تیلیوں کا ایک پنجرا تھا جس میں سے ایک چڑیا نکلتی اور قسمت کا حال جاننے والوں کے لئے بہت سے لفافوں میں سے ایک لفافہ نکال کر لاتی۔ اس سے تھوڑی دور ہٹ کر ایک فقیر ایک بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے بھیک مانگ رہا تھا۔ اور سڑک پر رکشے چل رہے تھے۔ جن میں آدمی دو دو آدمیوں کا بوجھ لادے تھکے ہارے آگے بڑھ رہے تھے۔

وفد کے ممبر یہ سب دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے

www.taemeernews.com

اس طرح یہ وفد پاکستان کے مختلف لیکن ایک سے شہروں کو دیکھنے گیا۔ کوئٹہ۔ سکھر۔ ملتان۔ منٹگمری۔ سیالکوٹ۔ راولپنڈی اور آخر میں لاہور پہنچا۔ ہر جگہ ہی انھوں نے پاکستان کے بجائے ہندوستان کا لفظ استعمال کیا اور ہر بار ہی پاکستانیوں کو انھیں بتانا پڑا کہ وہ لوگ اس وقت پاکستان میں ہیں۔

یہاں تک کہ وفد دس دن پاکستان میں رہ کر جب ہندوستان آنے کے لئے واگہ کے بارڈر پر آیا تو وہاں بھی پاکستان کے بڑے افسروں نے جب انھیں پاکستان کو ہمیشہ یاد رکھنے کے لئے کہتے ہوئے خدا حافظ کہا تب بھی غیر ملکی وفد کے لیڈر نے کہا۔ آپ اور آپ کے ملک ہندوستان کی مہمان نوازی ہمیں ہمیشہ یاد رہے گی۔"

"ہندوستان نہیں پاکستان" پاکستانی افسر نے یاد دلایا۔

"ہاں۔ ہاں پاکستان" غیر ملکی نے ہنستے ہوئے کہا اور ہاتھ ملا کر ہندوستان کی طرف قدم بڑھائے۔ جہاں ہندوستانی افسروں کا ایک گروہ انھیں خوش آمدید کہنے کے لئے موجود تھا۔

یہاں یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ غیر ملکی وفد کے لیڈر نے مسکراتے ہوئے ہندوستانی افسروں کو بتایا کہ اسے بڑی خوشی ہے کہ آپ پاکستانی لوگ اتنی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کر رہے ہیں اور ہمیں آپ کے ملک پاکستان اور عوام کو قریب سے

www.taemeernews.com

دیکھ کر، اُن سے مل کر بڑی خوشی ہو گی۔
اور یہی بات وہ بار بار تردید کرنے کے باوجود اس وقت بھی پھر کر دہرائیں گے جب وہ دس دن بعد دہلی، آگرہ، بمبئی، کلکتہ لکھنؤ وغیرہ دیکھ کر اپنے ملک کو لوٹ رہے ہوں گے۔
اور ہاں۔ یہاں بھی کسی ریزرو بینک کے سامنے چڑیا والے جیوتشی، مانگنے والے فقیر اور رکشے چلاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں نہایت خوش ہوں گے۔

www.taemeernews.com

مہرباں کیسے کیسے

میرے وہاں پہنچنے پر وہ بے حد خوش ہوئے۔ وہ قہقہے لگا کر ہنسے۔ خوب گاتے اور ناچتے رہے۔ انھوں نے میرے اعزاز میں دل کھول کر دعوتیں بھی دیں۔ میں بھی دل ہی دل میں خوش ہوا کہ اچھی جگہ پہنچ گیا ہوں۔ چار دن کی زندگی اچھی گزر جائے گی۔

لیکن یہ خوشی وقتی ثابت ہوئی۔ کیونکہ اگلے ہی دن انھوں نے میرے دونوں بازو اتار کر میرے سامنے ہی دیوار پر ٹانگ دیے۔ اب میں ایک طرح سے ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ یعنی ایسا آدمی جو کچھ کرنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر مصیبت یہ تھی کہ میں سوچتا بہت تھا۔ نتیجے کے طور پر اپنے بازوؤں کے نہ ہونے کی وجہ سے میں بہت دکھی رہنے لگا۔ ایک تو یہ کہ میرے دل کے تمام ولولے تمام خواہشیں دل ہی دل میں محل کر وہیں دفن ہو کر رہ جاتی تھیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میرے بازو

www.taemeernews.com

میرے کمرے میں ہی میرے سامنے دیوار پر ٹنگے رہتے تھے۔ اپنے بازوؤں کو اتنے قریب لیکن اپنے وجود سے اتنی دور دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگتے۔

میرے دکھی ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جن لوگوں نے خود ہی میرے بازو میرے جسم سے الگ کر کے دیوار پر ٹانگ دیئے تھے۔ وہی مجھے ناکارہ اور کام چور ہونے کی گالیاں دیا کرتے تھے۔

ایسے میں نہ تو میں ان کا ہی کچھ بگاڑ سکتا تھا اور نہ ہی نجات کا کوئی ذریعہ تھا۔ نتیجے کے طور پر جھلاہٹ، غصہ، غم اور آنسو ہی میری زندگی تھے۔

اس طرح ایک مدت بیت گئی

پھر ایک دن انہی میں سے ایک آدمی چپکے سے میرے پاس آیا اور میرا مہربان بنتے ہوئے بولا: "یہ سب لوگ جنھوں نے تمہارے بازو اتار کر دیوار پر لٹکا رکھے ہیں۔ یہ سب تمہارے دشمن ہیں۔" میں تمہارا سچا ہمدرد ہوں اور تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں تمہارے بازو تمہارے جسم کے ساتھ دوبارہ لگائے دیتا ہوں۔

اپنے بازو واپس ملنے کی خوشی میں، میں اس کی پچھلی تمام زیادتیاں ایک ہی لمحے میں بھول گیا اور اس آدمی کو فرشتہ

www.taemeernews.com

سمجھتے ہوئے میں نے اس کی طرف ممنون نظروں سے دیکھا۔
اس نے اسی وقت میرے بازو دیوار سے اٹھا کر میرے جسم کے ساتھ لگا دیئے۔ میں خوش تھا کہ اب میرا جسم مکمل ہے اور میں اپنی ضرورت اور طاقت کے مطابق کام کر سکوں گا۔
میں نے شکرانے بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ایک سرپرست کی سی حیثیت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "اب دل بھر کر کام کرو۔"
اور میں اسی وقت سے کام کرنے میں مشغول ہو گیا۔ کیونکہ میرے اسی مہربان نے میرے لیئے اسی کمرے میں اتنا کام مہیا کر دیا تھا کہ دم مارنے کی فرصت نہیں تھی۔
میں ایک لمبی مدت تک بلا رکے اور بلا آرام کیئے کام کرتا رہا آرام کرنے کی بات مجھے اس لئے نہیں سوجھی کہ جس مہربان آدمی نے میرے بازو توڑے تھے۔ اسی شیطان نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میرے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ لہٰذا کام کرتے ہوئے کچھ سوچنے اور سمجھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اور نتیجے کے طور پر جسم مشین کی طرح کام کرتا رہا بلا رکے۔
وہ تو بھلا ہو۔ ایک دوسرے آدمی کا جو مجھے بے ہوش گرا ہوا پا کر میرے پاس آیا۔ میرے منہ پر پانی چھڑک کر وہ مجھے ہوش میں لایا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر اس نے میرے سوئے ہوئے دماغ

www.taemeernews.com

کو جگایا اور تب مجھے پتہ چلا کہ وہ آدمی جس نے مجھے بازو دیئے تھے اس نے ایسا میری نہیں بلکہ اپنی بھلائی کے لئے کیا تھا۔ اس نے مجھے ہاتھ تو دیئے تھے لیکن میرا دماغ محض اس لئے ماؤف کر دیا تھا تاکہ جب وہ مجھ سے زیادہ کام لے تو میں اس کے خلاف احتجاج نہ کر سکوں۔

میں نے ہوش میں آتے ہی دوسرے آدمی کی طرف مشکور نگاہوں سے دیکھا جس نے مجھے موت کے منہ سے بچایا تھا۔

جاتے ہوئے وہ آدمی کہنے لگا۔ اب تم بہت تھک گئے ہو۔ اور کام کرو گے تو مر جاؤ گے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میری ٹانگیں میرے جسم سے الگ کیں اور دیوار پر اسی جگہ ٹانگ دیں۔ جہاں کبھی میرے بازو ٹنگے رہتے تھے۔

اب آخری عمر میں جب میں معذور اور مجبور ہو کر رہ گیا ہوں۔ تو جب بھی میرے اندر کبھی کبھی زندگی حرکت کرنا چاہتی ہے تو میری آنکھوں میں دیوار پر ٹنگی ٹانگوں کو دیکھ کر آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ اگر یہ لوگ میرے ساتھ یہ نیکیاں نہ کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔

www.taemeernews.com

ایک منی بغاوت

سنیئے صاحب. بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ؟. مجھ ایک سال کے بچے کو کسی اور کی دیکھ ریکھ میں چھوڑ کر میرے ماں باپ خود نوکری کرنے چلے جاتے ہیں. سچی بات تو یہ ہے کہ میرے دل میں اس کے لئے بہت غصہ ہے اور آج میں نے اپنے دل میں اُن سے لڑنے کا پکا فیصلہ کیا ہوا ہے اسی لئے دوپہر سے ہی میں ان کے لوٹنے کا انتظار کر رہا ہوں کہ کب وہ شام کو آئیں اور میں ان سے مورچہ لوں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ پوت کپوت ہو جاتے ہیں لیکن والدین، والدین ہی رہتے ہیں. لیکن اگر آپ میری پریشانی کو دیکھیں جو گھر میں اکیلا ماں باپ کی کمی محسوس کرتا رہتا ہے. تب تو آپ کو یقین کرنا ہوگا کہ آج کل ماں باپ بھی صحیح معنوں میں ماں باپ نہیں رہ گئے. اب دیکھئے نہ میری ماں مجھے روز گھر پر چھوڑ کے جاتی ہے اور وہ بھی دھوکے سے کبھی مجھ سوتے کو ہی چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور کبھی لولو پوپو" یعنی پیار

www.taemeernews.com

دلار کے جھوٹے بہانے بنا کر۔ تمہیں وہ پھول توڑ دوں۔ آہا کتنا اچھا ہے لال لال۔ بالکل میرے لعل کی طرح۔ بس جی ایسے ہی میٹھی میٹھی باتیں کرتی پتہ نہیں لگتا کہ کس وقت گھر سے باہر نکل جاتی ہے اور جو میرا باپ ہے اس کا تو کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ وہ ماں سے بھی زیادہ چالاک ہے۔ جب وہ میرے ساتھ زیادہ پیار جتاتا ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ اب وہ مجھے چھوڑ کر جانے والا ہے پھر کہیں رات کو اس کی شکل دکھائی دے گی وہ بھی اگر میں جاگتا ہوا تب۔

میں ابھی بچہ جو ہوں۔ یہ دونوں بڑی آسانی سے میری آنکھوں میں دھول جھونک کر مجھے بیوقوف بنا کر کھسک جاتے ہیں۔ اب آج کی بات ہی لیجیے۔ میری ماں تو آج مجھے سوتے ہوئے کو چھوڑ کر ہی چل دی تھی اور میرا باپ میرے ہاتھ میں ایک کھلونا دے کر خود بھالو کی طرح ناچنے لگا۔ ناچتے ناچتے اس نے مجھے اٹھا لیا۔ اپنے ہاتھوں سے میرے بال سنوارے۔ مجھے بڑا مزہ آیا۔ لیکن اس لمحاتی خوشی میں بھی ڈر کا عنصر شامل تھا۔ کہ کہیں ایسے ہی پیار کرتا ہوا کہیں یہ مجھے چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ اور وہی ہوا بھی۔ مجھے گود سے اتار کر اس نے میرے ہاتھ میں ایک گیند دے دی۔ وہ گیند کو میری طرف پھینکتا تھا اور میں ادھر اُدھر لڑھکا دیتا تھا۔ ہر بار میرا باپ ناچتا ناچتا جاتا اور گیند لا کر مجھے دے دیتا۔ میں بڑا خوش تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا باپ میرے ساتھ کھیل نہیں رہا بلکہ گھر سے باہر جانے کا بہانہ تلاش کر رہا ہے۔ بس جی!

www.taemeernews.com

ایک بار گیند ذرا دور چلی گئی۔ میرا باپ گیند پکڑنے گیا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ خیر آج آ تو لے۔ نہ گود میں بیٹھ کر اس کی داڑھی نوچی تو میرا نام بھی بٹو نہیں ہے۔

لڑائی کی تیاری کے لئے میں نے پہلا کام یہ کیا کہ جس میز پر میرے باپ کی کتابیں رکھی تھیں۔ اس کے میز پوش کو کھینچنا شروع کیا تاکہ کتابوں کا ستیاناس کیا جا سکے۔ مناسب موقعہ بھی مل گیا تھا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ میری بھوا جس کے پاس میرے باپ مجھے چھوڑ کر جاتے تھے۔ صحن میں لیٹی دھوپ سینک رہی تھی۔ یا سو گئی تھی۔ میز پر کتابیں کافی تھیں۔ اس لئے میز پوش کو کھینچنا آسان نہیں تھا۔ لیکن میں بھی آہستہ آہستہ اچھل اچھل کر جھٹکے دیتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میز پوش کھسکنا شروع ہو گیا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ کتابیں میز پوش سب کچھ زمین پر آ رہا۔ میں بھی گر پڑا۔ سیاہی کی دوات گر کر ٹوٹ گئی اور میرے ہاتھ پاؤں اور کپڑے رنگ گئے۔ گرنے سے مجھے تھوڑی چوٹ بھی لگی تھی۔ لیکن لڑائی میں کوئی معمولی چوٹوں کو تھوڑی دیکھتا ہے۔ اور پھر لڑائی میں تو خون ہو جاتے ہیں۔ لہو بہنے لگتا ہے۔ مجھ پر تو صرف سیاہی ہی گری تھی۔ اس کی کون پرواہ کرتا۔ اگر باپ کی کتابیں فرش پر بکھر کر خراب ہو رہی تھیں۔ تو میرے ہاتھ پاؤں کو سیاہی لگنے سے کونسی آخر آ گئی تھی۔ مجھے چوٹ لگنے کا بھی کوئی افسوس نہیں تھا اور بڑی گرم جوشی سے سیاہی بھرے ہاتھوں سے کتابیں رنگ رہا تھا۔ دل تو کرتا تھا کہ ماں کی ریشمی ساڑھی کو بھی اسی طرح

www.taemeernews.com

خراب کردوں۔ لیکن وہ اونچی ٹنگی ہوئی تھی اور میرا ہاتھ وہاں تک نہیں پا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اپنے چھوٹے ہونے کا افسوس ہوا۔

اتنے میں میری بھوا اندر آ گئی۔ میں ڈر گیا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو اس لئے میں نے تریا چرتر کھیلا۔ لڑائی میں سب کرنا پڑتا ہے میں نے منہ بسور کر رونے والا منہ بنا لیا۔ بھوا نے مجھے اٹھا کر میرے ہاتھ پاؤں دھوئے کپڑے بدلے۔ اب میں لڑائی کے پہلے مورچے پر کافی تھک گیا تھا۔ دیکھئے نہ کتابیں خراب کرنے کے لئے کتنی محنت کرنی پڑی تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ دوسرا حملہ کرنے سے پہلے اگر فوجیں تھوڑا آرام کر لیں تو اچھا رہے گا۔ اس لئے میں سو گیا۔

جب میں جاگا۔ تب میرے ماں باپ ساتھ والے کمرے میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آواز سن کر مجھے غصہ آ گیا غصے والی بات ہی ہے۔ اس سے پہلے جب وہ باہر سے آتے تھے تو پہلے میرے پاس آتے تھے۔ پہلے مجھے بلاتے تھے اور آج انھوں نے پرواہ ہی نہیں کی تھی میں سمجھ گیا کہ کتابیں خراب ہوئی دیکھ کر وہ مجھ سے ناراض ہیں اور ان کی طرف سے بھی باقاعدہ لڑائی کا اعلان ہو گیا ہے۔ اس لئے نہیں بھی کروٹ بدل کر دم سادھے لیٹا رہا اور دل ہی دل میں لڑائی کے طریقے سوچتا رہا۔

ایک طریقہ میرے ذہن میں یہ آیا کہ پیٹ درد کا بہانہ کر کے آج رات کو ان دونوں کو پریشان کیا جائے۔ رات کی سردی میں جب ماں

www.taemeernews.com

کو مجھے اٹھا کر چپ کرانا پڑے گا اور باپ کو ڈاکٹروں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑیں گے۔ تو ہوش آجائے گا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس میں تو خود کو بھی بڑی پریشانی ہوگی۔ جھوٹ موٹ رونا پڑے گا۔ جو بہت مشکل کام ہے۔ ڈاکٹر کی کڑوی کسیلی دوائی بھی پینی پڑے گی اور ہو سکتا ہے ڈاکٹر سوئی لگائے۔ ایک بار مجھے سوئی لگی تھی تو بڑا درد ہوا تھا۔ اس لئے اپنی جھگی جلا کر تماشہ دیکھنے والی بات کچھ جچی نہیں۔

تبھی میری ماں کمرے میں آئی۔ اس نے ہنستے ہوئے مجھے اٹھانے کی کوشش کی: "جاگ گیا میرا لعل۔۔۔" لیکن میں اس کی موہو ٹھگنی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے نہ تو اس کی طرف پہلے کی طرح مسکرا کر دیکھا اور نہ ہی اپنے ہاتھ بڑھائے کہ وہ مجھے اٹھائے۔ پھر بھی اس نے مجھے اٹھا لیا اور الماری سے بسکٹ نکال کر مجھے کھانے کو دیا میں نے غصے سے بسکٹ کو دور پھینک دیا۔ اتنے میں میرا باپ بھی آگیا اس نے ہنستے ہوئے میرے گالوں کو پیار سے تھپتھپایا اور مجھے اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ لیکن میں نے اس کے پاس جانے سے انکار کر دیا جب اس نے مجھے گود میں اٹھانے کے لئے دوبارہ ہاتھ بڑھائے تو میں نے اپنے ہاتھ سے باپ کو مارنا شروع کر دیا۔ ابھی اس نے تھپتھپانے کے بہانے میرے گال پر جو چپت لگائی تھی اس کا بدلہ تو مجھے لینا ہی تھا نہ۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں پر کتنے ہی تھپڑ مارے۔

www.taemeernews.com

ماں مجھے باپ کے پاس نہ جاتا دیکھ کر اپنا حق زیادہ جتانے لگی۔
اس نے کہا: "تو میرا بیٹا ہے۔ اسی لئے آپ کے پاس نہیں جاتا۔"
باپ نے اپنا حق جتانے کے لئے مجھے ماں کے ہاتھوں سے چھیننا چاہا
مجھے بولنا نہیں آتا تھا۔ اگر میں باتیں کر سکتا تو کہتا: "تمہیں لڑنا ہے تو
آپس میں لڑو۔ اپنی لڑائی میں میری ٹانگیں کیوں گھسیٹ رہے ہو۔"
اس پکڑ دھکڑ میں میرے بازو پر کھنچاؤ پڑا تو میں احتجاج میں چیخ پڑا۔
ماں نے کھلونے میرے آگے رکھ کر مجھے فرش پر بٹھایا تو میں نے سوچا چلو
اس بہانے ان دونوں سے جان تو چھوٹی۔

تھوڑی دیر بعد میری ماں نیم گرم دودھ لے کر آئی میرے لئے۔ پہلے تو
میں نے ہاتھ مار کر دودھ گرا دینے کی صلاح بنائی لیکن پھر خیال آیا کہ
لڑائی کرنے سے پہلے دودھ پی لینا اچھا رہے گا۔ جسم میں چستی آجائے
گی۔ اس لئے میں نے دودھ پی لیا۔ اور جو بسکٹ تھوڑی دیر پہلے فرش
پر پھینک دیا تھا اسے بھی تھوڑا سا کھا لیا اور باقی احتیاطاً ہاتھ میں پکڑ کر
رکھ لیا تاکہ لڑائی میں کسی وقت بھوک لگے تو کام آسکے۔

تبھی باپو نے مجھے گود میں اٹھایا اور باہر باغیچے میں لے گیا۔ وہاں
باپ نے مجھے دو پھول بھی توڑ کر دیئے لیکن میں نے باپ کی طرف
خشک برتاؤ ہی رکھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ میرا باپ پڑوس والے گھر کی عورت
سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ مجھے سوجھ گئی کہ اس باغیچے میں مجھے
کھیلنے کے لئے لانا تو محض ایک بہانہ تھا۔ دراصل باپو ماں سے چوری چوری

www.taemeernews.com

اس عورت سے پیار کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں یہ بات کسی طرح ماں پر ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بولنا جو نہیں آتا۔ گھر میں جا کر میں نے ماں کے سامنے آ۔ آ کر کے بہت شور مچایا لیکن میری ماں کچھ نہ سمجھ سکی۔ اور میرا یہ وار خالی چلا گیا۔ لڑائی میں کئی حملے بیکار بھی تو ہو ہی جاتے ہیں۔ اس لئے میں نے حوصلہ نہ ہارا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ ماں نے نئے کپڑے بدل لئے اور باپ بھی مجھے ماں کو پکڑا کر کپڑے بدلنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ ان کی کہیں جانے کی تیاری ہے۔ دونوں کی اس خاموش تیاری نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ کیونکہ مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہو پایا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے یا نہیں۔ میں نے غصے کے مارے ماں کے سر پر ہاتھ مار مار کر اس کے بال اس طرح بگاڑ دیئے کہ اسے ایک مرتبہ پھر شیشے کے پاس جا کر اپنے بال دوبارہ سنوارنے پڑے۔ میں اپنی اس کامیابی پر بڑا خوش تھا

ماں نے اپنے بال ٹھیک کرنے کے بعد میرا منہ دھویا اور مجھے بھی نئی فراک اور سوئٹر پہنا دیئے۔ پھر ماں چھی چھی کرتی ہوئی مجھے پیشاب کرانے لگی۔ پیشاب مجھے لگا تو تھا لیکن اس کے چھی چھی کرنے پر میں نے پیشاب نہ کیا۔ پھر بابو بھی مجھے اٹھا کر کتنی دیر چھی چھی کرتا رہا۔ لیکن میں نے اُدھر کوئی دھیان ہی نہ دیا۔

میرے پاس لڑنے کے لئے کوئی بارود گولی سکہ تھوڑی تھا۔ پیشاب وغیرہ کا ہی تو میرے پاس بڑھیا ہتھیار تھا۔ اسے میں ایسے ہی کیوں

www.taemeernews.com

ضائع کر دیتا؟ پھر بابو نے مجھے اٹھا لیا۔ میں دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ لوگ پھر مجھے گھر پر ہی نہ چھوڑ جائیں۔ اتنے میں میرے باپ نے کہا: "یہ بڑا بدمعاش ہے۔ پیشاب نہیں کرتا۔ ایک تو آج میری کتابیں سیاہی سے رنگ دی ہیں" میں بڑا خوش ہوا اور دل ہی دل میں کہا: "بابو ابھی کیا ہوا ہے۔ تو آج مجھے دھوکا دے کر چلا گیا تھا نہ۔ اس لئے آج میں بھی تجھے ایسے کرارے ہاتھ دکھاؤں گا کہ ساری عمر یاد کرے گا کہ کوئی ملا تھا ایسا ویسا۔

میری خوش قسمتی سے ماں باپ نے باہر جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ میں بڑا خوش تھا۔ ماں اور باپ دونوں کا خیال تھا کہ میں باہر آنے کی وجہ سے خوش ہوں اور میں سوچ رہا تھا کہ اچھا موقعہ ملا ہے۔ آج ان دونوں کو بھرے بازار میں پریشان کروں گا۔

بازار میں ایک جگہ باپ کسی سے بات کرنے کے لئے رک گیا۔ مجھے ماں نے اٹھایا ہوا تھا۔ حملہ کرنے کے لئے میں نے یہ موقعہ بہت مناسب سمجھا۔ اس لئے میں نے زور کی پیشاب کی دھار جو ماری تو بابو کے گرم کوٹ اور پینٹ پر ایک لمبی چوڑی لکیر بن گئی۔ بابو تت تت کرتا ڈر کا مارا یوں پیچھے ہٹا جیسے دشمن کے اچانک حملہ کر دینے سے فوجی گھبرا اٹھتے ہیں۔ ماں کے گود سے نیچے اتارتے اتارتے میں نے اسے بھی بھگو دیا۔ میں خوش تھا کہ ایک ہی حملے سے دونوں دشمن پسپا کئے تھے۔ اور خود سوکھا بچ گیا تھا۔ میری پینٹ میں راستہ بنا ہوا تھا۔ اس لئے میں بھیگنے سے بچ گیا۔

آگے جا کر ایک دکان پر ماں اور بابو کوئی چیز خریدنے کے لئے گئے پہلے

www.taemeernews.com

تو میرا دھیان دکان میں پڑی ہوئیں بہت سی رنگ برنگی چیزوں کی طرف کھینچ گیا۔ یہ چیزوں کو دیکھتے دیکھتے میری نظر ایک کھلونے پر آ کر ٹک گئی۔ میں نے اچھل اچھل کر اس کھلونے کی طرف اشارہ کیا۔ باپو سمجھ گیا کہ میں ہوائی جہاز لینا چاہتا ہوں۔ اس کی قیمت زیادہ ہو گی۔ اس لئے ماں باپ دونوں نے مجھے کوئی اور چیز لینے کے لئے اکسایا۔ یہ گڑیا لے لو۔ لیکن میں مچل گیا۔ اور جب تک ہوائی جہاز لے نہ لیا شور مچاتا رہا۔

دکان سے باہر نکلتے ہوئے باپو کہہ رہا تھا۔ ٹِنو بڑا بدمعاش ہو گیا ہے میں نے دل میں کہا۔ ابھی تم نے میری بدمعاشی دیکھی کہاں ہے؟ ٹھہر جاؤ ابھی تو میں تمھیں مزا چکھاؤں گا۔

اور آخر میں نے ان کو مزا چکھا دیا۔ مجھے راستے میں ماں باپ باری باری اٹھاتے تھے۔ اور میں نے ہوائی جہاز کی مدد سے ان کے ہاتھوں اور بازوؤں اور کمر اور گردن میں اتنی چوٹیں لگائیں کہ وہ عاجز آ گئے یہ حملے گھر پہنچنے تک جاری رہے۔

گھر پہنچنے پر ماں باپ یہ چاہتے تھے کہ میں جلدی سے سو جاؤں۔ اسی لئے جب تک ماں باپ روٹی کھائیں۔ مجھے بھوا نے دودھ پلا دیا۔ روٹی کھانے کے بعد ماں چارپائی پر لیٹی کافی دیر تک مجھے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن میں آج دوپہر کے بعد سارا دن سوتا رہا تھا۔ اس لئے میں خود سونا نہیں بلکہ دوسرے سونے والوں کی نیند خراب کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے جب بھی ماں ذرا سی اونگھتی۔ میں اس پر ہوائی جہاز

www.taemeernews.com

دے مارتا۔ ماں نے تنگ آکر مجھے ایک تھپڑ بھی مارا۔ میں رو پڑا۔ لیکن مجھے مار کھانے کا افسوس نہیں تھا۔ لڑنا ہو تو کسی کو مارنے سے پہلے خود بھی مار کھانے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ اور میں اس کے لئے تیار تھا۔

مجھے روتے ہوئے دیکھ کر بابو نے مجھے اپنے پلنگ پر کھینچ لیا۔ میں اسے بھی تنگ کرتا رہا۔ آخر بابو نے تنگ آکر بتی بجھا دی۔ میں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اور ضد کی بابو کو بتی پھر جلانی پڑی۔

شاید بابو کو بتی کی روشنی میں نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس لئے اسے بڑی پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ کبھی آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرتا اور کبھی کروٹ بدل کر۔ اُدھر ماں بھی دوسرے پلنگ پر کروٹ لئے لیٹی ہوئی تھی۔ جب بہت دیر تک ان دونوں نے کروٹ نہیں بدلی تو میں سمجھ گیا کہ ان دونوں نے لڑائی میں ہار مان لی ہے۔

اپنی جیت کا احساس ہوتے ہی میں بھی ایک فاتح کی طرح ماں کی چارپائی پر گیا اور اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ جب میری آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں تب میں نے اپنی ماں کی ساڑی اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لی تاکہ صبح وہ مجھے سوتے ہوئے چھوڑ کر کہیں جا نہ سکے۔

www.taemeernews.com

تین لڑکیاں

صبح کو کملا کی ماں دیر سے سو کر اٹھی۔ اس بات کا اندازہ، اسے پہلے ہی دن کی روشنی میں ڈوبتے ہوئے تاروں کو دیکھ کر نہیں، بلکہ اندرا اور چندرا کے گھر سے آ رہی دودھ دوہنے کی آواز سے ہوا۔ پہلے وہ جھاڑو وغیرہ دینے کے بعد انگیٹھی سلگا دیتی تھی۔ جب کہیں ادھر سے دودھ دوہنے کی آواز آیا کرتی تھی۔ پڑوسی گھر میں پال رکھی بھینس کا دودھ بیئیں اور اس کے گھر میں پانی ملا ہوا دودھ اور وہ بھی سونے کے بھاؤ آئے۔ کملا کی ماں یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ اس لئے سویرے ہی سویرے ہمیشہ کی طرح اس کا دل خراب ہو گیا۔ "ہوں" وہ بڑبڑائی: "لڑکیوں کی کمائی پر بھینس نہیں، ہاتھی پال لو۔ لیکن ایک دن یہ سب نکلے گا ضرور۔ لڑکیاں دفتر میں نوکر کیا ہو گئیں۔۔۔۔" وہ اٹھی رسوئی گھر میں جا کر چولہے کے پیچھے ماچس ٹٹولنے لگی۔ "پتہ نہیں کلموہی نے کہاں رکھ دی ہے؟" ماچس کے نہ ملنے پر، اس نے غیر ارادی طور پر اپنی لڑکی کو گالی دے دی۔ اگر یہی گالی کوئی دوسری عورت اس کی لڑکی

www.taemeernews.com

کو دیتی تو وہ اس سے لڑتے وقت گلی محلہ سر پر اٹھا لیتی اور جب تک گالی دینے والی عورت کے اگلے پچھلے کوس نہ دیتی اسے چین نہ پڑتا لیکن اس وقت اسے احساس تک نہ ہوا کہ اس نے اپنی خوب صورت جوان سال لڑکی کو جو انٹرمیجیٹ تک پڑھی ہوئی ہو اور جس کی شادی کے سلسلے میں جہیز کے سوال نے اسے پریشان کر رکھا ہے۔ کلموہی کہا ہے۔

ماچس مل گئی۔ اس نے دیا روشن کیا طاق پر رکھے ہوئے کٹورے میں سے دندا سا لیا اور منہ میں رکھ لیا۔ دیا لے کر کمرے کی طرف چلنے لگی تو ہوا کے نرم جھونکے سے بھوں کرتا ہوا دیا بجھ گیا۔ وہ سٹپٹا گئی۔ اندرا اور چندرا کے صحن میں لگے ہوئے بجلی کے بلب کی روشنی اس کے صحن میں بھی آ رہی تھی اسی روشنی میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی جھاڑو اسے دکھائی دے گئی۔ اس لئے اس نے دوبارہ دیا نہ جلانے کا فیصلہ کر لیا۔ دیئے کو دوبارہ طاق پر رکھ کر وہ صحن میں جھاڑو دینے لگی۔ سوچا، روشنی ہو جانے پر ہی کمروں کو صاف کروں گی۔ صحن کا کوڑا سمیٹ کر باہر پھینکنے لگی تو اندرا اور چندرا کے مکان کے سامنے اینٹوں کا انبار لگا دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ رات کو دس بجے کے قریب جب وہ بشن دیئی کے مکان سے باتیں کر کے لوٹی تھی۔ تب تو یہاں کچھ نہیں رکھا تھا اُسے اپنا منہ پھیکا پھیکا سا معلوم ہوا ایک طرف تھوکتے ہوئے اور مونہہ سے دندا سا باہر پھینکتے ہوئے وہ بڑبڑائی۔ "کتنی بار کہا ہے، بنارسی داس سے، کڑوا دندا سا دیا کر کڑوا۔ لیکن یہ لنجا ہے بڑا بے ایمان۔ دوسرے کے پیسے حرام سمجھتا ہے۔" تھوکنے کے بعد بھی اسے اپنا مونہہ پوچھ رہی تھی کہ

www.taemeernews.com

سامنے بشن دیئی دکھائی دے گئی، جو نل پر برتن دھو رہی تھی۔ "دیکھ لیا بہن! پہلے بجلی لگوائی۔ پھر گھر کے اندر نل لگوایا۔ اب نیا کمرہ بننے والا ہوگا۔" بشن دیئی اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر بولی۔

ایک کمرہ نہیں۔ محل بنالیں، بہن محل۔ لیکن ایک دن اس مکان پہ کلنک کا ٹیکا نہ لگا تو میرے منہ پر تھوک دینا۔ لالچ میں آکر آنکھیں اندھی ہوگئیں ہیں تو خود سیانی ہے۔ ایک مرد کی کمائی سے بھی کچھ بنتا ہے؟ تم دیکھ رہی ہو کملا کے پتا ہر مہینے دو سو لاتے ہیں۔ اس سے تو گزر بھی نہیں ہوتی، اتنے ٹھاٹھ کہاں سے ہو سکتے ہیں۔" پھر وہ دم بھر کے لئے رک کر بولی، اب کون سمجھائے جوان جوان لڑکیاں مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کام کریں گی تو کوئی نہ کوئی گل کھلے گا ہی کون جانے باہر کیا کرتی ہیں؟ کوئی روک ہے؟"

"دفتر کے آدمی تو بہن بہت دور کی بات ہے۔ اب میں کیا کہوں اپنی بھی جوان لڑکیاں ہیں۔ کوئی چغلی تو ہے نہیں۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ اپنی بستی کے کئی لڑکے اندرا اور چندرا کا دفتر تک پیچھا کرتے ہیں۔"

ہائے میں مر گئی۔ کون سویرے سویرے اپنا منہ گندہ کرے۔ بھگوان کو جان دینی ہے۔ جو کریں گے سو بھریں گے۔ ہمیں کیا بہن؟"

اتنے میں اندرا اور چندرا دونوں سفید قمیضیں اور شلواریں پہنے ہوئے اپنے گھر سے باہر نکلیں۔ وہ دونوں ہر روز سیر کو جایا کرتی تھیں۔ جب وہ دونوں ان کے پاس سے ہو کر آگے نکل گئیں۔ تو کملا کی ماں نے سر مارتے ہوئے کہا۔ "جاری ہوں گی کسی یار کو ملنے۔ نہیں تو بہن، جوانی کی نیند۔ اتنی سویرے کہیں آنکھ کھلتی

www.taemeernews.com

ہے۔ میری کملا ابھی بے خبر سو رہی ہوگی۔"

"اور نہیں تو کیا۔ میری راجی تو اس وقت سو کر اٹھتی ہے جب چائے کی پیالیاں کھٹکھٹاتی ہوں اور پھر لڑکیوں کا یوں اکیلے جانا کچھ اچھا بھی تو نہیں لگتا۔"

"سب اچھا لگتا ہے۔ راجی کی ماں! شرم بھی ہو۔ لیکن ہمیں کیا۔ ہماری طرف سے جہنم میں جائیں۔ پڑوسی کے ناطے فرض تھا۔ سمجھا دیا۔ جوان لڑکیوں کو اتنی چھٹی دینا اچھا نہیں۔ ماں باپ ہی کو اچھا لگتا ہوگا اور لگے بھی کیوں نہ۔ ہر مہینے جھولی بھر روپے گھر آجاتے ہیں۔ لڑکیاں بیسواؤں کی طرح گھومتی ہیں ماں رانی بنی رہتی ہے۔"

بشن دیئی برتن دھو چکی تو اٹھا کر اپنے گھر کی طرف چلدی۔ کملا کی ماں نے بھی دیوار سے لگی ہوئی جھاڑو اٹھائی اور گھر کے اندر چلی آئی۔ کملا صحن والی چارپائی سے اٹھ کر برآمدے میں پڑی ہوئی خالی چارپائی پر چلی گئی تھی۔ اور بے سدھ سو رہی تھی۔ دوپٹہ سینے سے ہٹ کر پیٹ پر چلا گیا تھا جو کہ چارپائی سے نیچے لٹک کر زمین کو چھو رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بشن دیئی سے باتیں کرتے ہوئے کملا کی ماں نے بڑے فخر سے کہا تھا: "میری لڑکی تو جوانی کی نیند سوتی ہے۔" لیکن اس وقت کملا کا اس طرح بے ڈھبے پن سے سونا کسی طرح اچھا نہ لگا۔ اسے کندھے سے ہلاتے ہوئے قدرے چیخ کر بولی: "سورج گز گز آگیا ہے۔ ابھی نیند ہی نہیں پوری ہوئی۔ میں کہتی ہوں بیگانے گھر جائے گی تو کیا کرے گی۔ صحن سے اٹھی تو یہاں آکر مر گئی۔ اور کتنی بار کہا ہے کہ جوانی آئی ہے تو سنبھال کر رکھ۔ اپنا آپ سمیٹ کر سویا کر چڑیل۔"

اور اسی لمحے اس نے بازو سے پکڑ کر کملا کو اٹھا دیا وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی جب تک کملا اٹھے ہی اٹھے، وہ اس کے ہاتھ میں جھاڑو دے کر بولی: "تمہاری قسمت میں جھاڑو

www.taemeernews.com

دینا ہی لکھا ہے۔ لو دونوں کمرے صاف کر لو۔ تب تک انگیٹھی سلگائے دیتی ہوں۔

کملا کی ماں نے انگیٹھی سلگا کر باہر گلی میں رکھدی اور خود برتن صاف کرنے لگی۔ جب وہ نل سے برتن دھو کر آئی تو انگیٹھی سلگ چکی تھی۔ اس نے آواز دی "کملا" کملا کا کوئی جواب نہ ملا۔

"ارے کہاں مر گئی تو۔ انگیٹھی بیکار جا رہی ہے۔"

"آئی ماں!" اس نے اندرا کے گھر سے آواز دی۔

"آئی کی بچی۔ سویرے ہی سویرے اُن چنالوں کے ہاں کیا کرنے گئی تھی۔ اس نے کملا کے گھر آجانے پر کمرے کے اندر جا کر کہا۔ "یہ جوان لڑکیوں کے جانے نہیں کہ ہر نیوں کی طرح جہاں دل آیا۔ کودتی پھریں اور پھر کتنی بار سمجھایا ہے کہ ان بیحیاؤں کے ساتھ نہ بیٹھا کر وہ تو بدنام ہیں ہی، ساتھ تو بھی..... ہائے میں کیسے سمجھاؤں میری تو قسمت بگڑ گئی ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں سے ماتھا پیٹ لیا۔

"تیرا دماغ چل گیا ہے۔ بھابھی" کملا، جو صبح سے دو دفعہ گالیاں کھا چکی تھی ضبط نہ کر سکی اور ماں کو روتے اور بڑبڑاتے چھوڑ کر غسل خانے چلی گئی۔ نہا دھو کر کپڑے بدل چکی تو اس کے پتاجی سیر سے لوٹ آئے تھے اس نے چائے بنانے کے لئے پانی کی کیتلی انگیٹھی پر رکھ دی۔ کملا کی ماں اب تک دوسرے کمرے میں گم سم بیٹھی تھی۔ بیٹی کو دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا۔ بولی "اس کلموہی کے اب ہاتھ پیلے کر دو۔ مونہہ پھٹ ہو گئی ہے۔ مجھ سے نہیں سنبھالی جاتی، ٹکے ٹکے کا تو جواب دیتی ہے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ "گھر میں کپڑے بھی ہیں۔ اسے دینے کے لئے کہ ہاتھ ہی پیلے کر دینے کی فکر ہے؟ کچھ پیسے اکٹھے ہو جائیں۔ تب تو ایک ترتی ملنے پر

www.taemeernews.com

اب تو گھر گرہستی کچھ چلنا شروع ہوئی ہے۔"

پھر وہ کملا سے مخاطب ہو کر بولے: "یہ جس دفتر میں اندرا اور چندرما جاتی ہیں نا؟ اس میں تین چار مہینے کی ایک عارضی جگہ خالی ہے۔ ابھی سیر کرنے گیا تو وہاں کے سپرنٹنڈنٹ مل گئے تھے۔ تمھارے لئے کہا تھا۔ مان گئے۔ اگر مرضی ہو تو ان دونوں کے ساتھ آج ہی چلے جانا۔ میرا نام لے دینا۔"

"چلی جاؤں گی۔" کملا خوشی سے اچھل کر بولی۔

"ہاں ہاں چلی جانا۔ کوئی حرج نہیں۔ ممکن ہے کوئی مستقل جگہ بھی مل ہی جائے۔"

کملا کی ماں یہ سب سن رہی تھی۔ کچھ نہ بولی۔ وہاں سے ہٹ کر باہر نل پر پانی لینے کے لئے چل دی۔ بشن دیئی بھی وہاں پانی بھر رہی تھی اسے دیکھتے ہی بولی۔

"کچھ اور سنا تم نے۔ وکرم کور کہیں سے سن کے آئی ہے۔ اندرا اور چندرا کے چال ٹھیک نہیں سنا ہے۔ دفتر سے نکل کر ہوٹلوں میں غیر مردوں کے ساتھ ....."

"لوگوں کی بہن تم نے بھلی کہی۔" کملا کی ماں بشن دیئی کی بات کاٹ کر بولی۔ "زمانے کی کوئی زبان روک سکتا ہے۔ کسی کو شرم بھی نہیں آتی۔ دوسروں کی لڑکیوں کو بدنام کرتے۔"

بشن دیئی اس غیر متوقع جواب کو پا کر حیران ہو گئی۔ اس کی بالٹی بھر گئی تھی وہ چلی گئی۔ تو ساڑھے نو بجے کے قریب اس نے اندرا اور چندرا کے ساتھ کملا کو بھی جاتے دیکھا تو سوچنے لگی مرد کاموں پر چلے جائیں تو کملا کی ماں سے پوچھوں گی۔ ان میسواؤں کے ساتھ کملا کو کہاں بھیج دیا۔

---

www.taemeernews.com

ایک غریب یگ

میرے دادا، نگڑ دادا اور پھر نگڑ دادا کے بھی نگڑ دادا اس طرح پچھلی پیڑھیوں کے سات آٹھ بزرگ اور میری آنے والی نسلوں کے سات آٹھ بچے یعنی میرے پوتوں کے پوتے اور پھر ان کے بھی ہونے والے پوتے سب کے سب میری جھونپڑی میں آ کر ایک گول دائرے میں بیٹھ گئے۔ بزرگوں اور آنے والے بچوں کے بیچ میں بیٹھا تھا ایک پھٹا ہوا کرتا اور دھوتی پہنے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ میرے گھر کے اپنے خصوصی مہمان اتفاق سے ایک ساتھ اکٹھے ہو گئے ہیں تو ان کے لئے اچھے کھانے کا انتظام کیا جاتا لیکن اتنے آدمیوں کو روٹی کھلانا میرے لئے ناممکن تھا۔ اس لئے میرا لڑکا نل سے صرف ایک بالٹی پانی بھر لایا تھا وہ بھی آدھ گھنٹہ قطار میں انتظار کرنے کے بعد۔ اسی میں سے سب نے ہتھیلیوں کی اوک سے پانی پیا اور پھر بات چیت شروع ہوئی۔

سب سے بڑا بزرگ ذرا سا کھانسا۔ پھر اپنے سر کی پگڑی کو ٹھیک کیا

www.taemeernews.com

اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کہو ہو! تم کو دیکھنے کی بڑی اچھا رہی۔ پر تم کو ان پھٹے پرانے کپڑوں میں اور جھونپڑی کی وہی خستہ حالت دیکھ کر تو من کو بہت رنج ہوا تمھیں دیکھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم میں اور مجھ میں جو آج سے سات آٹھ سو سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا ہے جہاں تمھاری رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے وہاں تمھارے گرد میری غریبی بھی اسی طرح طواف کر رہی ہے۔"

ندامت کے مارے میری نظریں زمین پر گڑی جا رہی تھیں اور میں اس بزرگ کی طرف دیکھنے کے بجائے زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔

کیا یہ مکان اب بھی ساہوکار کے پاس گروی ہے۔

"ہاں"۔ میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن میں نے تو چھڑوا لیا تھا"

پیشتر اس کے کہ میں کچھ بولوں۔ اس بزرگ کا پوتا میری طرح سر جھکائے ہوئے مری ہوئی آواز میں بولا کہ اس نے پھر گروی رکھدیا تھا

"ہوں"۔ سب سے بڑے بزرگ نے ایک لمبی سانس لی۔ اور بولا معلوم ہوتا ہے ہم لوگ اتنی پیڑھیاں مل کر ایک پھٹے ہوئے کرتے کو نہیں سی پائے"۔ اس نے میرے کرتے کے چھید میں انگلی ڈالتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا۔ کیا ہم سب ناکارہ تھے۔ نکمے تھے اس نے جیسے یہ سوال خود سے بھی کیا اور ہم سب سے بھی۔

www.taemeernews.com

میں نے کہا: "میں تو دن بھر محنت کرتا ہوں۔ گدھے کی طرح بوجھا ڈھوتا ہوں لیکن پھر بھی ...."

میرے ہاتھوں پر پڑے ہوئے محنت کے نشان بتا سکتے ہیں کہ میں ساری زندگی محنت کرتا رہا ہوں" ایک بزرگ نے اپنی صفائی میں کہا اور اپنے مضبوط ہاتھ سب کے سامنے پھیلا دیئے۔

"محنت تو ہم سبھی کرتے رہے ہیں۔ سب کے سب بزرگ ایک ساتھ بول اٹھے۔

"ہم سب کے سب جھک مارتے رہے ہیں" بڑے بزرگ کو جلال آ گیا تھا۔ اور پھر بڑے تحمل سے بات کو بدلتے ہوئے بولا" اچھا تو سیٹھ کی اولاد کا کیا حال ہے"

"ان کی کوٹھیاں ہیں کاریں ہیں۔ بڑے مزے میں رہتے ہیں"۔

"مجھے میں تو وہ پہلے بھی رہتے تھے"

اس کے بعد کچھ دیر سناٹا رہا۔ بڑا بزرگ اپنی پگڑی اونچی کر کے سر کو کھجاتا رہا اور پھر بولا" اچھا تو اب بادشاہ کون ہے"

اب بادشاہ کا راج نہیں۔ اپنے دیش میں تو جنتا کا راج ہے

"جنتا کا راج؟ میں سمجھا نہیں"

"ہمارے جمانے میں تو انگریز کا راج تھا۔ گوری چمڑی والے کا"

ایک بزرگ بیچ میں بول پڑا۔ لیکن بڑے بزرگ نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا" یہ جنتا کا راج کیا ہوتا ہے"؟

www.taemeernews.com

یعنی ساری جنتا مل کر اپنے میں سے کچھ لوگوں کو چنتی ہے اور پھر وہی راج کرتے ہیں۔"

"تب تو تمہاری حالت سدھر جانی چاہیئے تھی"؟

مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا اور میں پھر زمین پر لکیریں کھینچنے لگا۔

بڑے بزرگ نے ایک لمبی سانس لی۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ اور پھر بولا "معلوم ہوتا ہے ہماری قسمت میں یہی بدا ہے۔ ہم پہلے غریب تھے۔ اب غریب ہیں اور آگے چل کر بھی غریب ہی رہیں گے۔ جب تک دھرتی کا یہ چکر ختم نہیں ہو جاتا تب تک ــــ"

کچھ دیر سناٹا رہا۔

اب کی بار سناٹے کو میرے کسی آنے والے پرپوتے نے توڑا۔ "اگر اس گھر کی یہی حالت رہتی ہے تو میں اس گھر میں جنم لینے سے باز رہا۔"

"میں بھی اس تنگ جھونپڑی میں آ کر نہیں رہوں گا۔" دوسرا بچہ بولا "میرا تو ابھی سے اس میں دم گھٹ رہا ہے۔ اس حالت میں پوری زندگی گزارنا کیسے ممکن ہے"؟

"چپ رہو۔ پیدا ہوئے نہیں۔ باتیں پہلے ہی بنانے لگے۔" بڑے بزرگ کو جلال آ گیا تھا۔ اس کے گرجتے ہی سارے بچے بھیگی بلی کی طرح خاموش ہو گئے۔ بزرگ نے اٹھ کر تھوڑا ٹھنڈا پانی پیا۔ اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ میرا خاندان ختم ہو جائے۔ کیا تم اپنی اور اپنی آنے والی نسلوں کی حالت سنوارنے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے"؟

www.taemeernews.com

"آنے والی نسلوں کی حالت سنوارنے کی بات تو بعد میں بھی سوچی جاسکتی ہے۔ پہلے تو رات کی سردی کو دور کرنے کی بات سوچی جائے کسی بزرگ نے کہا۔

"ہاں کاکا۔ پہلے تو اس سردی سے بچاؤ کا کچھ بندوبست کرو۔ نہیں تو ہم چلے۔" آنے والی نسلوں میں سے کوئی بچہ بولا۔

میرے پاس اس وقت گھر میں اتنا ایندھن بھی نہیں تھا جو سب کو گرمی پہنچانے کے لئے کافی ہو۔ اور اپنے مہمانوں کی کوئی خدمت نہ کر پانے کی وجہ سے میں دل ہی دل میں شرمساری محسوس کر رہا تھا اس لئے اگلے لمحے میں۔ میں نے کچھ فیصلہ کیا اور سب کو دو منٹ کے لئے جھونپڑی سے باہر آنے کو کہا۔ جب سب لوگ باہر آ گئے تو جھونپڑی کو آگ دکھا دی۔

پھر ہم سب لوگ اس کے گرد بیٹھ کر سوچ بچار کرتے رہے کہ اس لوگوں کی غریبی کو کیسے دور کیا جائے۔ میری آنے والی نسلوں کے لئے جھونپڑی کو آگ لگنا ایک دلچسپ کھیل تھا۔ ایک بچہ جلتی ہوئی لکڑی کو ہوا میں لہراتا ہوا خوش ہو کر دوسرے کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔ "اچھا ہوا جھونپڑی جل گئی۔ اس میں پیدا ہونے سے تو جان چھوٹی۔"

www.taemeernews.com

اپنے جیسا

لوگ جتنا اُسے اچھا آدمی سمجھتے تھے اتنا ہی وہ مجھے بُرا لگتا تھا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ لوگوں کا اُسے اچھا کہنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔

وہ ہمارے دفتر میں ابھی ابھی تبدیل ہو کر آیا تھا، لیکن جس طرح وہ سب میں مقبول ہو گیا تھا اور جس طرح لوگ اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے اُس سے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہمارے دفتر کا بہت پرانا کارندہ ہو۔

کوئی کہتا: "بہت ہی شریف ہے اور زبان کتنی میٹھی ہے۔"

دوسرا کہتا: "اور محنتی کتنا ہے۔ سارا دن اپنے کام میں مست۔ نہ کسی کی لین میں نہ دین میں۔"

تیسرا کہتا: "کام بھی جانتا ہے۔ ہر بات سمجھتا ہے۔"

چوتھا کہتا: "دیوتا ہے جی دیوتا۔ ہنس مکھ۔ ہر وقت ہنس کر ملتا ہے۔ سب کی عزت کرتا ہے، یہاں تک کہ چپراسی کو بھی جی کر کے بلاتا ہے

www.taemeernews.com

لوگ جس قدر اس کی اس طرح تعریفیں کرتے، اتنی ہی میرے دل میں اس کے لئے نفرت بڑھتی گئی۔ حالانکہ اس نفرت کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی۔ نہ ہی تو اس کے آنے سے میرے وقار میں کمی ہوئی تھی۔ نہ ہی میری شخصیت پر اس کا کوئی اثر پڑا تھا۔ نہ ہی وہ میری ترقی کے راستے میں رکاوٹ تھا۔ اس کی ترقی کا سلسلہ دوسرا ہے۔ میرا دوسرا مطلب یہ کہ دفتری کام کاج میں کہیں بھی میرا اور اس کا مقابلہ یا ٹکراؤ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی پتہ نہیں کیوں ؟..... نہیں نہیں مجھے پتہ ہے کہ مجھے اُس کی یہ دیوتا سی صاف ستھری شخصیت اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں سوچتا تھا اس میں بھی بہت سی خامیاں ہوں گی جنہیں وہ اپنی اچھائیوں کی چادر تلے چھپائے بیٹھا ہے۔

اُس کے لئے اپنی اس نفرت کا اظہار میں کئی طرح کرتا تھا۔ ایک تو میں اُسے خود کبھی نہیں بلاتا تھا۔ عمر میں وہ مجھ سے بڑا تھا اور اصولاً مجھے ہی اُسے پہلے مخاطب کرنا چاہیئے تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ وہی مجھے پہلے نمستے کرے یا بلائے۔ وہ جب پہلے نمستے کرتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ جیسے میں اس پر یہ ثابت کر دیتا کہ تم مجھ سے چھوٹے یا کمتر ہو۔ اس کے علاوہ اگر کوئی کہتا کہ وہ بڑا محنتی ہے تو میں اُس کی اس طرح اونچی ہوئی شخصیت کو نیچا کرنے کے لئے فوراً بول اُٹھتا "ہاں کئی دیکھے ایسے محنتی۔ وہ جو شی کم محنتی تھا۔ اس دفتر میں کونسا کام تھا جو جوشی نہیں کرتا تھا۔ اسی محنت کی بدولت اُس کی ترقی ہو گئی اور....."

اس طرح موقع ملنے پر میں ہمیشہ اس کی برائی کرتا رہتا تھا۔ لیکن ایکبار مجھے خاص موقع بھی مل گیا۔ ہوا یہ کہ کچھ دنوں کے لئے اُسے بیٹھنے کے لئے میرے

www.taemeernews.com

کمرے میں جگہ دے دی گئی۔ کچھ دنوں بعد ہی مجھے اُس کے خلاف شکایت کا موقع مل گیا۔ اُس دن اُس سے ملنے کے لئے باہر سے کتنے ہی لوگ ایک ساتھ آئے اور کافی دیر تک بیٹھے گپیں ہانکتے رہے۔ میں تو صرف بہانے کی تلاش میں تھا۔ فوراً بڑے افسر سے شکایت کر دی کہ اس کے پاس باہر سے فالتو آدمی آکر بیٹھتے ہیں جن سے میرے کام میں خلل پڑتا ہے۔ بے شک میری شکایت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور بڑے افسر نے اُسے کچھ نہ کہا۔ لیکن پھر بھی مجھے خوشی تھی کہ میں نے دفتر کے اُس آدمی کے خلاف شکایت کی ہے جسے سب آدمی اچھا سمجھتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اس طرح بڑے افسر کے دل میں کچھ تو اس کے خلاف شک اُبھرے گا ہی۔ جتنی دیر وہ میرے کمرے میں بیٹھتا، میں اُس کی بے عزتی میں ایک اور طرح بھی کرتا رہا۔ اُسے چائے پینے کا بہت شوق تھا ہر آدھے پون گھنٹے بعد کسی نہ کسی بہانے اس کی میز پر نئی چائے کی ٹرے رکھی ہوتی۔ وہ ہر بار مجھے چائے پیش کرتا اور ہر بار میں اس کی پیش کش کو ٹھکرا دیتا اور اُس کی چائے ختم ہونے کے بعد اپنی چائے منگوا کر پیتا۔ اس طرح میں اسے یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ مجھے اس کی چائے کی پرواہ نہیں ہے۔

ایسے ہی دن گزرتے گئے اور جیسے جیسے دفتر میں اس کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی بڑھتی رہی ویسے ویسے میرے دل میں اس کے لئے نفرت بھی بڑھتی رہی۔ مجھے ویسے یہ بھی حیرانی ہوتی تھی کہ اب تک اُس نے میری اس نفرت کی مخالفت کیوں نہیں کی تھی۔ اس سے مجھے اور بھی چڑھ ہوتی تھی۔

www.taemeernews.com

آہستہ آہستہ اُس کی یہ تصویر خود بخود ٹوٹنی شروع ہو گئی۔ ایک دن مجھے کسی نے بتایا کہ میں نے اُس کے ساتھ بیٹھ کر شراب پی ہے اور اُس کے شراب پینے کے ڈھنگ سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پکا شرابی ہو۔ میں نے اس بات کو پلے باندھ لیا۔ باتوں باتوں میں کہہ دیتا۔ فلاں سے ایسے سنا ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔ اس طرح بات کر کے میں دوسرے کے سامنے اُس کی تصویر بھی پھیکی کر دیتا اور خود بھی اچھا بنا رہتا۔ پھر پتہ لگا کہ وہ بڑے افسر کے گھر بہت جاتا ہے۔ میں نے بات بنائی کہ ضرور چغلیاں کرنے جاتا ہوگا یا چاپلوسی کرنے۔ اسی طرح پتہ لگا کہ اس نے دیوالی کی رات کو کیور کے ساتھ جوا کھیلا اور اس کے آدھے پیسے جیت لئے۔ کیور نے مجھے خود بتایا کہ بے شک ہم لوگ شغل شغل میں ہی کھیل رہے تھے اور وہ بھی ایک دو روپے لے کر لیکن اُس کے چال چلنے اور بلف کرنے کے انداز سے پتہ لگتا تھا کہ بڑا گھاگ کھلاڑی ہے۔

ایک دن میرے ساتھ باتیں کرتے وہ خود ہی کھل گیا۔ اس نے بڑے مزے لے لے کر اپنی کتنی ہی خامیوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ بچپن میں اُسے چوری کرنے کی بہت بُری لت تھی اور اب بھی وہ بڑا لالچی ہے۔ مطلبی ہے اور اسی لئے وہ کسی دوسرے کی مدد وہ کم ہی کر پاتا ہے

جب وہ اپنی خامیوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرے دل سے بوجھ اُتر رہا ہو۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یہ تو اپنے جیسا ہی ہے۔ اسی لئے اُس وقت وہ مجھے بڑا اچھا لگا۔ میرے دل

www.taemeernews.com

میں اس کے لئے چھپی نفرت دُھل گئی

اگلے دن جب وہ آیا، اس وقت ہم پانچ چھ آدمی دفتر کے سامنے والے دالان میں کھڑے تھے۔ اسے دیکھ کر ہم میں سے ایک آدمی بولا: "یار یہ آدمی بھی بیچ سے کھوکھلا ہی نکلا۔" اس سے پہلے کہ کوئی اُس کی حامی بھرتا، میں بیچ میں ہی بول پڑا: "نہیں یہ تو بڑا پیارا انسان ہے، بہت ہی اچھا۔"

پھر جب وہ ہمارے نزدیک آیا تو میں نے پہلی بار پہلے ہاتھ اٹھا کر نمستے کی اور اپنا ہاتھ ملانے کے لئے بڑھایا۔

اس کی آنکھوں میں اُس وقت پہلے سے زیادہ چمک تھی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ ہنس مُکھ لگ رہا تھا۔

www.taemeernews.com

تیسری فتح

"کیا آپ مجھے اخبار پڑھ کر سنا سکیں گے؟"

اس چھوٹے سے سوال سے چندر نگر کے رہنے والے بہت سے لوگ واقف ہوں گے۔

گول، سفید اور کٹی ہوئی داڑھی میں چھپے ہوئے جھریوں بھرے اب تو لال نہیں کہنا چاہیئے، پیلے چہرے والا بابا در یا ما ایک ہاتھ میں ڈنگوری لئے اور ایک بغل میں دو تین اخبار دبائے اکثر نظر آتا۔ سر پر ڈھیلی ڈھالی لیکن بہت بڑی پگڑی لمبی در زوں والا کرتہ پہنے اور سفید تہہ بند باندھے وہ ہر واقف اور ناواقف سے جسے اس کی بوڑھی آنکھیں پہچان سکیں کہ پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ سوال کر دیتا: "کیا آپ مجھے اخبار پڑھ کر سنا سکیں گے"؟ یوں وہ اب بھی چندر نگر کی سڑکوں پر دکھائی دیتا ہے لیکن اب اس کی بغل میں اخبار نہیں ہوتے نہ کسی سے وہ یہ کہتے سنا گیا کہ مجھے اخبار پڑھ کر سناؤ گے؟ ہاں معمول کے مطابق نہر کی طرف جو ہماری بستی سے دو میل کے

www.taemeernews.com

فاصلہ پر ہے وہ سیر کرتے ضرور جاتا ہے۔ رات کے پچھلے پہر جب پوراچندنگر گہری نیند میں سوتا ہے تو اس کی سنسان سڑکوں پر چاروں طرف پھیلی ہوئی خاموشی کو بابے دریامے کی ڈنگوری کی کھٹ کھٹ توڑ دیتی ہے۔ لوٹتے وقت اس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور ہوتی ہے۔ کسی درخت کی سوکھی ہوئی شاخ یا سوکھا گوبر۔ برسات کے دنوں میں وہ برساتی کھمبیں بھی ڈھونڈھ کر لایا کرتا ہے۔

یہ کوئی چار سال پہلے کی بات ہے میں اپنے مکان کے سامنے کھڑا تھا کہ کسی نے پکارا۔ "بابوجی ایک منٹ!"

میں نے دیکھا ایک بوڑھا بابا ہاتھ میں ڈنگوری تھامے آنکھوں پر موٹے شیشوں والا چشمہ لگائے میری طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا پھر وہ خود ہی بولا۔

"میرا نام دریاما ہے جی۔ آپ کے دائیں طرف والا مکان ہم لے لیا ہے۔"

"یہ شام لال والا مکان ؟"

ہاں جی یہی۔ ان کو الاٹ تو پورا ہی ہوا تھا۔ لیکن کلیم کی رقم کم تھی ہمارا بھی کلیم تھوڑا ہی تھا اس لئے دونوں نے مل کے....."

"بڑی اچھی بات ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔"

"بس جی مہربانی۔ ایک عرض ہے۔ آپ اخبار تو لیتے ہی ہوں گے۔ کل اخبار والا آکرے تو اس سے کہئے گا مجھے بھی دے جائے۔"

"آپ ابھی اخبار پڑھ لیتے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں ہاں یوں نظر اب کمزور ہو گئی ہے لیکن ابھی تو گزر کی کر یا ہے..."

www.taemeernews.com

"تب تو بڑی اچھی صحت ہے۔ اتنی زیادہ عمر ہوتے ہوئے بھی" میں نے اس کی طرف رشک سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو میں بھنے ہوئے چنے بھی چبا لیتا ہوں" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا منہ کھول دیا۔ جس میں کچھ دانت چمک رہے تھے۔

"اچھا بابا جی۔ اخبار والے کو ضرور بھیج دوں گا"۔

اس دن سے بابے دریامے سے روزانہ ملاقات ہونے لگی۔ جب میں نو ساڑھے نو بجے کے قریب دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلتا تو دریامے اپنے مکان کے برآمدے میں چارپائی پر بیٹھا اخبار پڑھتا ہوتا۔

ہماری بستی میں آنے کے کچھ ہی دن بعد بابے دریامے کی آنکھیں زیادہ کمزور ہو گئیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اب اخبار کے لفظ میری آنکھوں کے سامنے ناچتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور پڑھا نہیں جاتا۔ یہ کہتے ہوئے مجھے یاد ہے وہ اداس ہو گیا تھا۔ اُداس ہونے کی بات ہی تھی بیچارے کے پاس اس عمر میں وقت گزارنے کے لئے ایک ہی مشغلہ تھا اخبار پڑھنے کا وہ بھی جاتا رہا۔ پھر وہ روز سویرے میرے پاس آنے لگا۔ میں اخبار پڑھ کر سناتا۔ نو بجے کے قریب وہ خود ہی کہتا اب آپ کے دفتر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تیاری کرنا ہو گی۔ میں اخبار کسی دوسرے سے سن لوں گا۔ اور پھر سارا دن وہ بازار میں سڑک پر ہر ایک سے اپنا سوال دہرا دیتا۔

"کیا آپ اخبار پڑھ کر سنائیں گے"۔

"ہاں میں جواب ملنے پر بابے دریامے کی آنکھیں ہنس پڑتیں وہ خاموش

www.taemeernews.com

بیٹھا اخبار سنتا رہتا۔ اخبار سن لینے کے بعد وہ یہ کہنا کبھی نہ بھولتا: معاف کیجئے گا۔ آپ کو زحمت ہوئی۔ کبھی کبھی بابا دریامل اخبار پڑھ کر سنانے والوں کی چائے پانی سے خاطر تواضع بھی کر دیتا۔ ایک کے چلے جانے کے بعد وہ دوسرے کی تلاش میں لگ جاتا اور دوسرے کے چلے جانے کے بعد تیسرے کی اور اس طرح یہ سلسلہ سارا دن جاری رہتا۔ ایک خبر کو مختلف پڑھنے والوں سے وہ کئی بار سنتا۔ لیکن بابا دریامل یہ کبھی نہ کہتا کہ یہ خبر میں پہلے سن چکا ہوں کوئی دوسری خبر سنائیے۔ بس وہ چپکے سنتا رہتا۔ سیدھے سادھے دیہاتی ماحول میں پیدا ہونے والا بابا دریامل اب بھی اتنا ہی سادہ لوح تھا اور وہ سیاسی الجھنوں سے ہمیشہ دور رہا۔ اس نے سیاسی مسئلوں کو سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی شاید اس میں اس کی اہلیت بھی نہ تھی۔ وہ تو اخبار صرف وقت گزارنے کے لئے پڑھتا اور سنتا تھا اور بس۔

بابے دریامل نے مجھے بتایا تھا: ملک کی تقسیم سے کچھ پہلے تک میں لوہار کا کام کرتا تھا اور جب میرے بوڑھے جسم نے یہ سخت کام کرنے سے انکار کر دیا تب بھی وہاں گاؤں میں بہت سے کام تھے میں دیسی پٹ سن کی رسیاں بنایا کرتا تھا۔ اسی میں دل بہلا رہتا تھا۔ لیکن ملک کی تقسیم کے بعد جیتا راجیت سنگھ لکھنؤ آ گیا تو میرے لئے پہاڑ سا دن بیکار بیٹھے بیٹھے بتانا مشکل تھا۔ وہ تو کہو "اردو کے چار لفظ جانتا تھا اور اخبار پڑھنے سننے کا شوق ہو گیا۔ ورنہ میں تو سمجھتا ہوں۔ زندگی اجیرن ہو جاتی"۔ وہ مجھے بھی سخت محنت کرنے کی تلقین کیا کرتا اور اپنے بیٹے اجیت سنگھ سے تو وہ بڑے سخت لفظوں میں کہتا: "کوئی کام

www.taemeernews.com

کیا کر کوئی کام چھ گھنٹے دفتر کی کرسیاں توڑ آئے تو سمجھ لیا کہ بڑا تیر مار آئے۔ مجھے کٹائی کے دنوں میں آدھی آدھی رات تک درانتیاں بنانا اور دھار تیز کرنا پڑتی تھی اور یہ ہے کہ دفتر سے آیا اور تاش لے کر بیٹھ گیا۔ میں کہتا ہوں ...."

بابے دریامے نے اخباروں کی ایک فائل بھی بنا رکھی تھی۔ کبھی کبھی وہ پوری فائل لئے بازار میں دکھائی دیتا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کا یہ شوق دیکھ کر حیران ہوا کرتا تھا ــــ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ وہ بیمار ہو گیا ہے میں دیکھنے کے لئے گھر پر گیا۔ بڑا تیز بخار تھا۔ گھر والے سوچ رہے تھے بچے گا نہیں لیکن وہ بچ گیا۔

بچ تو گیا لیکن بخار کی شدت اور جسم کی کمزوری کی وجہ سے اس کے دونوں کان خراب ہو گئے۔ وہ بہرا ہو گیا۔ جب بوڑھے دریامے کو اپنے بہرے ہو جانے کا احساس ہوا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی بوڑھی اور کمزور آنکھوں سے چھم چھم آنسو برستے دیکھے۔ بات ہی ایسی تھی۔ بوڑھا ہو جانے پر لوہار کا کام چھوٹا تو اس نے پٹ سن کی رسیاں بنانا شروع کیں۔ وہ کام چھن گیا تو اخبار پڑھنے کا شغل اختیار کیا۔ آنکھیں خراب ہوئیں تو لوگوں سے پڑھوا کر اخبار سننا شروع کیا اور اب قدرت کی اس نعمت سے محروم ہو کر اس کا دل ٹوٹ گیا اس کے عزائم کو شکست ہو رہی تھی۔ اب وہ کسی سے اخبار نہیں سن سکتا تھا۔ اس کا شغل جو اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ اس سے لے لیا گیا تھا اس کی روح کی غذا چھن گئی تھی لیکن بابا دریاما ان آدمیوں میں سے نہیں جو ہمت ہار کے بیٹھ جائیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے۔ جو زندگی میں ایڑی سے

www.taemeernews.com

بڑی اور سخت سے سخت مشکل کے آگے بھی کبھی سپر انداختہ نہیں ہوئے۔ بابے دریامے کی طبیعت واقعی ایک لوہار جیسی ہے جو اپنے طاقتور بازوؤں کی مدد سے لوہے جیسی سخت چیز کو اپنی مرضی کے مطابق مختلف شکل دے دیتا ہے۔

ایک دن صبح سویرے میں سیر کی غرض سے کانپور جانے والی سڑک پر نکل گیا۔ راستہ میں ایک بیل گاڑی میں سے بابے دریامے کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ وہ بیل گاڑی پر بیٹھا ہوا گاڑی بان سے کہہ رہا تھا۔

"ایک دفعہ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ...."

اس کے کچھ دن بعد میں نے بابے دریامے کو بہت سے بچوں میں گھرے ہوئے پایا۔ وہ ان کو کوئی دلچسپ کہانی یا قصہ سنا رہا تھا۔

اپنا وقت گزارنے کے لئے بابے دریامے کا یہ نیا شغل ہے اور عزم و ارادہ کی تیسری فتح۔

www.taemeernews.com

دُھول

اب یہ سڑک جو پکی دکھائی دے رہی ہے۔ اکیس سال پہلے یہ بالکل کچی تھی۔ اونچی نیچی تھی۔ جا بجا گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ گرد میں پاؤں دھنس دھنس جاتے تھے۔ تانگے پر بیٹھے ہوئے اتنے ہچکولے لگتے تھے کہ جسم کا انگ انگ دکھنے لگتا تھا۔ سائیکل چلانا اتنا مشکل تھا کہ جگہ بہ جگہ پہیے مٹی میں پھنس جاتے تھے۔ پیدل چلتے تھے تو دھول پاؤں سے اُڑ کر پنڈلیوں اور گھٹنوں تک پہنچتی تھی۔ جب کبھی ذرا تیز ہوا چلتی تھی تو اتنی دھول اڑتی تھی، اتنی دھول اڑتی تھی کہ اس سڑک پر چلنے والے دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھے ہو جاتے تھے اور بوڑھے مسافر مٹی میں مٹی ہو جاتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اس موڑ پر جہاں گاؤں سے آنے والی ایک کچی سڑک اس سڑک سے آ کر ملتی ہے۔ جو اندھا نوجوان مانگنے بیٹھتا تھا وہ شام ہوتے ہوتے ہر روز بوڑھا ہو جاتا تھا۔ اور ہر روز جب وہ اپنے سامنے پھیلی ہوئی چادر کو سمیٹتا تھا تو سکے اکٹھے کرتے ہوئے اس کے ہاتھ

www.taemeernews.com

دھول سے پوری طرح سن جاتے تھے۔ اور وہ اپنے ہاتھوں کو نلکے پر دھوتا ہوا اکثر کہتا تھا: رام جانے اس دھول سے کب چھٹکارا ملے گا۔

اور پھر جب کبھی کوئی اِکا دکا کار اس سڑک پر سے گزرتی تھی تو کتنی دیر تک فضا میں دھول کے گولے اڑا کرتے تھے۔ میلے کچیلے بچے اپنے پھٹے آستین والے ننھے ننھے بازو ہلا کر اور آنکھوں میں گرد بھرے ہر آن دور جاتے ہوئے مٹی کے گولے کی طرف دیکھ کر خوش ہوتے تھے حیران ہوتے تھے اور مایوس ہوتے تھے

لیکن یہ تو اکیس سال پرانی تصویر ہے۔ اب جب میں اس سڑک پر آیا ہوں تو اسے پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ اگر میں اس سڑک کے ہر موڑ ہر راہ سے واقف نہ ہوتا تو شاید یہ سمجھ لیتا کہ میں کسی اور سڑک پر آ گیا ہوں۔ اب یہ پکی ہو گئی ہے تارکول کی صاف ستھری پکی سڑک۔ اتنی ہموار اور صاف اور چکیلی کہ سڑک پر پاؤں پڑتے ہی خود بخود آگے بڑھنے لگتے ہیں اس وقت میرے سامنے سے رنگ برنگی تیز رفتار کاریں، بسیں، ٹرک اور بسیں گزر رہی ہیں۔ اس تیزی سے یہ گاڑیاں آ جا رہی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ پیٹرول کی طاقت سے نہ دوڑ رہی ہوں۔ بلکہ یہ سڑک خود انہیں اڑائے لئے جا رہی ہو۔

سڑک کے دونوں طرف بجلی کے کھمبے اس سڑک کی حضوری میں دربانوں کی طرح کھڑے ہیں۔ دونوں طرف لگائے گئے سایہ دار درختوں نے اس سڑک کی شان اور بھی دوبالا کر دی ہے۔ دور اس موڑ پر جہاں دونوں طرف کے پیڑوں کی شاخیں اوپر ایک دوسرے سے جڑی معلوم ہوتی ہیں وہاں

www.taemeernews.com

ایک محراب سی بن گئی ہے۔ جو دیکھنے میں بہت بھلی معلوم ہو رہی ہے اس بجلی کے کھمبے کے پاس چھوٹے چھوٹے بچے اپنی اسکول کی وردیوں میں ملبوس کندھوں پر بستے لٹکائے کھڑے ہیں۔ غالباً وہ اپنے اسکول کی طرف جانے والی بس کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک شرارتی لڑکا اُچھل اُچھل کر اونچے لٹکتے ہوئے گملے سے اپنے لئے پھول توڑنے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ وہ یہ خوب جانتا ہے کہ سڑک کے کنارے کنارے خاص طور سے لٹکائے ہوئے ان گملوں سے پھول توڑنا منع ہے۔

اور اب میں اس سڑک کے کنارے بنے فٹ پاتھ پر چل رہا ہوں تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ پالش کئے ہوئے میرے بوٹوں کی چمک اسی طرح برقرار ہے۔ ذرا بھی دھول نہیں لگی۔ ورنہ اکیس سال پہلے تو یہ حالت تھی کہ اس سڑک پر چلنا تو ایک طرف رہا۔ اگر کوئی اس کے کنارے بھی تھوڑی دیر کھڑا ہو جاتا تھا تو دھول سے اَٹ جاتا تھا۔ میں اپنے بوٹوں کی چمک سے خوش ہو کر فٹ پاتھ چھوڑ کر پکی سڑک پر آگیا ہوں۔ ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک ٹھک کی آواز جو میرے چلنے سے پیدا ہو رہی ہے اس سے میرے دل کو خوشی ہو رہی ہے۔ چلنے کے لئے طاقت مل رہی ہے اور اور میں اسی طرح چلتا چلتا اور سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے سایہ دار پیڑوں اور گملوں میں اُگے ہوئے پھولوں کو دیکھتا ہوا اب میں سڑک کے اس موڑ پر پہنچ گیا ہوں۔ جہاں وہ اندھا فقیر بیٹھا کرتا تھا اور جہاں گاؤں سے آنے والی کچی سڑک اس سڑک سے آکر ملتی ہے۔

www.taemeernews.com

وہ فقیر اب بھی وہیں بیٹھا ہے۔ اسی پتھر کے نیچے اور اس سے تھوڑی دور ہی پھولوں کے گملے لٹکے ہوئے ہیں۔ جن کو وہ اندھا ہونے کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتا۔ ممکن ہے کوئی ہوا کا جھونکا ان پھولوں کی خوشبو کو کبھی کبھی اس تک لے جاتا ہو۔

اب میں فقیر کے بالکل قریب پہنچ گیا ہوں۔ ان اکیس سالوں میں جن میں یہ بوڑھی سڑک جوان ہو گئی ہے۔ انہی اکیس سالوں میں یہ جوان فقیر واقعی بوڑھا ہو گیا ہے اس کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں آواز نحیف ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے ہاتھ اسی طرح پھیلے ہیں۔ اور گاؤں سے آنے والی سڑک اسی طرح کچی ہے۔ اس کچے موڑ پر ایک بیل گاڑی گزر رہی ہے۔ اور دھول اُڑ اُڑ کر فقیر کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ اور بوڑھا فقیر صدا دے رہا ہے۔ اس کچی سڑک کو بھی پکا کر دو بابا۔ ہم غریبوں کے بھی دُکھ ہرو بابا۔"

---

www.taemeernews.com

اپنا شہر

ملازمت کے سلسلہ میں پورے پانچ سال امرت سر میں گزارنے کے بعد وہ ایک مہینے کی چھٹی لے کر اپنے شہر لکھنؤ لوٹ رہا تھا۔ امرت سر کی دودھاؤ والی گلی میں اپنے مکان کو تالا لگاتے ہوئے اس کا ذہن اپنے لکھنؤ کے مکان کے دروازے کی چیں چیں سن رہا تھا۔ تبھی سردار وسا کھا سنگھ نے اپنی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"کتھے چلے او بادشاؤ (کہاں چلے بادشاہ)

"او جی۔ ایک مہینے کی چھٹی لے کر گھر جا رہا ہوں۔ لکھنؤ"

"اچھا اچھا۔ میں نے کہا جی۔ جلدی جلدی واپس آنا۔ آپ نے۔ آپ کے بنا نور رونق نہیں لگے گی"۔

وہ تالا لگا کر ہٹا تو رکشے والا اس کا سامان رکشے پر رکھ چکا تھا۔ ابھی وہ رکشے پر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ دربار صاحب سے لوٹتی ہوئی ہرمندر کور نے اس سے کہا:"تے بیٹا توں تر دی پیا ایں"۔ (اور بیٹا تم چل بھی دیئے)

www.taemeernews.com

"ہاں ماتا جی۔ گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔ اب اجازت دیجئے"۔
"جگ جگ جی پُتر، جوانیاں مانیں"۔ ہرمندر کور نے اسے آشیرواد دی۔
اس نے رکشہ والے سے کہا۔ "تم بڑھو۔ وہاں سڑک پر چل کر بیٹھوں گا"۔
رکشے والے کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اس کے کانوں میں ہرمندر کور کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ وہاں کھڑی اسے آشیرواد دیئے جا رہی تھی۔ ہربنس لعل کے گھر کے سامنے سے گزرا تو اس نے اپنی چھت سے پکارتے ہوئے کہا۔ "ارے سریوا ستوا جی، کہاں چل دیئے چپکے چپکے۔ کچھ بتایا ہی نہیں"۔
"ماسٹر جی پانچ سال ہو گئے گھر نہیں گیا تھا۔ بس ایک مہینے کے لئے"۔
گلی پار کرتے ہوئے محلے کے دو تین بچے اس کے ساتھ ہو لئے جن کو بڑے دلار سے اس نے واپس لوٹایا۔ دو تین اور دوستوں نے کھڑکیوں سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے الوداع کہی۔ اور جب وہ سڑک پر پہنچ کر رکشے پر سوار ہونے لگا تو اس نے دیکھا کہ محلے کا کتا ڈبو دم ہلاتا ہوا اس کے پاؤں سے لپٹ رہا تھا۔ وہ بہت محبت بھری آنکھوں سے بے زبانی کی زبان سے گویا اس سے پوچھ رہا تھا۔ "کہاں جا رہے ہو مالک"؟ اس نے کتے کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔ "گھبراؤ نہیں یار جلد لوٹ رہا ہوں"۔
رکشہ امرتسر کے تنگ بازاروں اور گلیوں سے ہوتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رکشے والے کو بھیڑ کی وجہ سے قدم قدم پر گھنٹی بجانی پڑتی تھی۔ راستہ بنانے کے لئے راہگیروں کو پکارنا بھی پڑتا تھا۔
"او نیچ موڑ توں"۔

www.taemeernews.com

"تیرے نیچے جیون اوماتا۔ ہٹ جا کرما والئے۔"

"ہٹ کے او بیبز۔ تہنوں سائیں دیاں رکھاں۔"

رکشا جب ہال بازار میں پہنچا تو سریواستو ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے وہ لکھنؤ کے چارباغ اسٹیشن سے اتر کر لاٹوش روڈ سے ہوتا ہوا اپنے مکان کی طرف بڑھ رہا ہو۔ ایسپلا نمنٹ، ایکسچینج، اے پی سین روڈ، نسٹریل کالج، مرادی لعل حکیم کی دکان، امین آباد کا موڑ، ہنومان کا مندر، جھنڈے والا پارک، کجا احاطہ ان سب کی مدھم سی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔ یکایک رکشے والے نے ایک موڑ پر تیزی سے رکشہ گھمایا تو اسے احساس ہوا کہ وہ ابھی ہال بازار سے نکل کر ریلوے پل تک ہی پہنچا ہے۔

ریلوے اسٹیشن پر بھی دو تین دوست اسے چھوڑنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ اس لئے گاڑی چلنے تک اس کا ذہن کچھ نہ سوچ سکا۔ لیکن گاڑی چلتے ہی جب اسے کچھ سکون ملا تو اس کا ذہن پھر لکھنؤ کے بازاروں اور گلیوں میں بھٹکنے لگا۔ امین آباد۔ قیصر باغ، لال باغ، حضرت گنج اور... افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اتنے سال لکھنؤ کیوں نہ جا سکا۔ اور اب جب پنجاب میل فراٹے بھرتی ہوئی تیزی سے بھاگ رہی تھی تو اسے ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ بہت ہی سست رفتاری سے چل رہی ہو۔ اس کا بس چلتا تو وہ اب تک اڑ کر لکھنؤ پہنچ گیا ہوتا۔

اس نے سوچا۔ اپنا شہر اپنا ہی ہوتا ہے۔ وہاں کی سڑکیں، پارکیں بازار، گلیاں اور اپنے محلے کے تو ہر موڑ سے وہ واقف ہے اسے یہ تک معلوم

www.taemeernews.com

ہے کہ امامی مسجد کے موڑ کے پاس جو کنواں ہے اس پر چڑھنے کے لئے پانچ چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں ہیں ان میں سب سے نچلی سیڑھی کی دو اینٹیں تب ٹوٹی ہوئی تھیں ممکن ہے اب بھی ٹوٹی ہوں۔ اور غلام حیدر کے پھاٹک کی پانچ میں سے دو دراڑیں اتنی کھلی ہیں کہ ان سے جھانک کر اندر آنگن میں کھلے پھولوں کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ انہیں دراڑوں میں سے کبھی کبھی رفعت کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جاتی تھی۔ اب پتہ نہیں رفعت کہاں ہو۔ ہو سکتا ہے اس کی شادی ہو گئی ہو.... اور پھر جب وہ اپنی گلی میں نکلتا تھا تو قدم قدم پر لوگوں سے علیک سلیک ہوتی تھی اور امین آباد کے بازار میں تو اسکا پکا اڈا تھا۔ جس ہوٹل میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ جاتا وہاں سے اٹھنے کی نوبت ہی نہیں آتی نوری سے اٹھے تو سندر سنگھ کے ہاں۔ وہاں سے اٹھے تو کاظمی میں۔ اسی طرح صبح سے شام ہوتی تھی۔

پرانی یادوں کے انہیں حسین خوابوں میں کھویا ہوا جب وہ لکھنؤ کے چارباغ ریلوے اسٹیشن پر اترا تو خوشی کے مارے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا قلی کے سامان اتارنے میں جو دیر لگ رہی تھی وہ بھی اسکو کھل رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد لکھنؤ کی اس زندگی میں پہنچنا چاہتا تھا۔ جہاں اس کے دوست احباب تھے۔ جانے پہچانے لوگ تھے پھاٹک کے پیچھے پھول جیتی ہوئی رفعت تھی اور نہ جانے کیا کیا۔ ریلوے اسٹیشن اسے اسی طرح لگا قلیوں میں ایک آدھ صورت ایسی لگی جیسے پہلے کبھی دیکھی ہوئی ہو۔ ریلوے پلیٹ فارم پر اس نے ادھر ادھر چاروں طرف دیکھا شاید کوئی جانی پہچانی صورت دکھائی دے جائے۔ وہ چاہتا تھا

www.taemeernews.com

کوئی چپکے سے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا کہے: "ماں حضرت کہاں سے تشریف لا رہے ہو۔ کہاں رہے اتنے دن۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اس کے دل میں دکھ کی ہلکی سی لہر اٹھی۔ لیکن اس نے دبا دیا اسے۔ مایوس ہونے کی بات ہی نہیں تھی اس نے کسی کو اطلاع دی ہوتی تو اسٹیشن پر اسے لینے کے لئے دوستوں کی ایک بھیڑ لگ جاتی۔ گھر پر اطلاع بھجوائی تھی، ماں کو وہ بے چاری بوڑھی عورت کہاں آتی۔

چابا غ سے اب رکشہ لاٹوش روڈ پر بھاگا جا رہا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے بنے ہوئے مکانوں اور دکانوں کو غور سے دیکھتا جا رہا تھا ایسا کرتے ہوئے اسے بڑی مسرت ہو رہی تھی۔ امین آباد میں پہنچ کر اس نے رکشے والے کو آہستہ آہستہ چلنے کو کہہ دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی پرانا دوست مل جائے۔ سندر سنگھ کے سامنے سے جب اس کا رکشہ گزرا تو اس نے غور سے اندر کی طرف جھانک کر دیکھا وہاں پر کوئی دوست یار تو کیا کوئی صورت نہیں تھی جسے پہلے دیکھا ہو۔ رکشا آگے بڑھ چکا تھا۔

اپنے محلے کچے احاطے جانے کے لئے اب اسے جھنڈے والی پارک کی طرف مڑنا تھا لیکن اس نے رکشے والے سے کہا کہ ہنومان مندر کی طرف سے ہو کر رفیو جی پارک کا چکر لگاتے ہوئے چلو۔ رفیو جی پارک کے کچھ حصے میں پکی دکانیں بن گئی تھیں بازار میں اسی طرح کی رونق تھی کوئی نہیں تھا تو کوئی اسکا اپنا یار بیلی، کوئی ہمجولی۔

رکشہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بہت تیز چل رہا ہو اور اسی لئے وہ اپنے جاننے پہچاننے والوں کو دیکھ نہ پا رہا ہو۔ دانش محل کی طرف جاتے ہوئے اسے ایک دو جانی پہچانی صورتیں

www.taemeernews.com

دکھائی بھی دیں لیکن ان سے اس کے کوئی مراسم نہیں تھے۔ رکشہ کچے احاطے میں
میں داخل ہوا اس کا خیال تھا کہ وہاں تو کوئی اپنا ملے گا ہی گلی میں بہت سے
لوگ آجا رہے تھے لیکن کوئی ایسا نہیں تھا جسے وہ بلا سکے۔ اچانک سامنے سے
ایک لڑکا آتا ہوا دکھائی دیا اس نے سوچا وہ دوبلے ہے اس کا پڑوسی اس
نے آواز دی اور اس کے رکنے پر اسے شرمندہ ہونا پڑا۔ وہ کوئی اور نکلا۔

آخر اس کا یہ رکشا اپنی گلی میں پہنچا وہاں تو اسے جاننے والے لوگ رہتے
ہی تھے لیکن بدقسمتی سے گلی میں کوئی نہیں تھا اس وقت کسی کی آواز نہیں
آرہی تھی۔ صرف رکشے کی کھڑکھڑ تھی۔ گلی کے تنگ موڑ پر رکشے والے نے رکشہ
روک دیا۔ اپنے گھر تک پہنچنے کے لئے گلی کے دو اور چھوٹے چھوٹے موڑ تھے تنگ سے
جہاں رکشہ نہیں جا سکتا تھا اس لئے رکشے والے کو سامان اتارنے کے لئے کہہ کر وہ
اپنے گھر کی طرف مڑا۔ ایک موڑ۔ پھر دوسرا موڑ۔ اور سامنے اس کا گھر تھا۔

اچانک ایک غیر آدمی کو دیکھ کر ایک کتا بھونکنے لگا۔ اس نے سوچا شاید
وہ کتا رکشے والے پر بھونک رہا ہو اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا
کتا اسی کی طرف دیکھتا ہوا بھونکے جا رہا تھا۔

اس نے ایک ہاتھ سے گھر کی گنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے سوچا شاید وہ کسی
اجنبی شہر میں آگیا ہے اس کا شہر تو امرتسر ہے جہاں کا ڈیوکتا بھی اس
سے آشنا ہے۔

www.taemeernews.com

خدا کا دوست

اجیت سنگھ تھا تو چور، لیکن واہیگورو کے ساتھ اس کے تعلقات بڑے دوستانہ سے تھے۔

یا ٹھ تو اس نے کبھی کیا نہیں دیا ٹھ کرنا اُسے آتا ہی نہیں تھا، کرتا بھی کیا؟) گوردوارے بھی وہ اسی وقت جاتا جب اسے چوری کرنے جانا ہوتا ـــــ یا پھر اس وقت جب وہ لمبا ہاتھ مار کر آتا۔ اور اس میں سے گوردوارے کا حصہ نکالنا ہوتا۔ خودارداس کرنی تو خیر اُسے آ ہی نہیں سکتی تھی لیکن وہ اپنی ارداس گوردوارے کے بھائی سے بھی تو نہیں کرا سکتا تھا۔ اب وہ بھلا اس سے کیا کہتا کہ کاہے کی ارداس کرے۔ کیا اس بات کی کہ ہے بھگوان آج کی رات بہت اندھیری ہو اور گھر والے بے خبر سوئیں کہ اُن کا گھر لٹ جائے اور انہیں پتہ ہی نہ چلے؟ یا یہ کہ ہے واہیگورو تیری کرپا سے اس بار کافی مال ہاتھ لگا ہے۔ اسی میں سے کچھ تجھے بھینٹ کرنے کے لئے لایا ہوں؟ ظاہر ہے، اس قسم کی ارداس گوردوارے کے بھائی کے بس کا کام

www.taemeernews.com

نہ تھا۔ اس لئے اجیت سنگھ خود مونھ ہی مونھ میں کچھ بڑبڑا کر اور جلدی سے اپنا چڑھاوا گولک میں ڈال کر گوردوارے سے یوں بھاگتا جیسے وہ واہگورو کی جیب کاٹ کر لایا ہو اور اسے ڈر ہو کہ کوئی اُسے پیچھے سے آکر پکڑ نہ لے۔ اگر گوردوارے کا بھائی اسے پرشاد لینے کے لئے آواز دیتا، تو بھی وہ ڈرتے ڈرتے اس طرح رکتا جیسے اُسے پکڑنے کی سازش ہو رہی ہے۔

بچپن میں پہلے پہل جب اسے اسکول بھیجا گیا، تو پنجاب میں پڑھائی پنجابی میں نہیں، اردو میں شروع ہوتی تھی۔ اور اجیت سنگھ کی پڑھائی الف اور ب سے آگے کبھی نہیں بڑھ سکی۔ اس کے موٹے دماغ میں یہ بات کسی طرح سماتی نہ تھی کہ الف اور ب مل کر اَب، کیوں بنتا ہے اور اسلفیے کیوں نہیں اور یہ الف میں بولی جانے والی "لِف" کہاں غائب ہو جاتی ہے؟ نتیجے کے طور پر جب وہ دوسرے لڑکوں کو بڑی بڑی کتابیں پڑھتے ہوئے دیکھتا تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے انھیں بھو، پڑھنا نہیں آتا اور وہ یوں ہی کتاب سامنے رکھے جھوٹ موٹ بول رہے ہیں۔ یا پڑھنے کا ڈھونگ رچا رہے ہیں۔

وہ پڑھ تو نہیں سکا، لیکن اُس کا جسم دیکھتے ہی دیکھتے یوں بڑھا کہ چودہ پندرہ سال ہی میں وہ بھرپور جوان ہو گیا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد۔ لمبے لمبے بازو، بڑی چوڑی سی چھاتی اور بھرا آنکھیں ایسے جیسے بھگوان نے چہرے پر دیئے جلا کر رکھ دیئے ہوں۔

جب گاؤں کی چوپال میں بیٹھے بیٹھے بڑے لوگوں کی کوئی بات اسکی

www.taemeernews.com

سمجھ میں نہ آتی تو وہ اپنی ان بڑی بڑی آنکھوں کو زور زور سے جھپکنے لگتا۔ اس پر بھی کچھ پلّے نہ پڑتا تو انجانے ہی اس کا مونھ یوں کھل جاتا جیسے وہ اس بات کو کھا کر سمجھنا چاہتا ہو۔ اور اس پر بھی جب اُسے ناکامی ہوتی تو وہ دائیں ہاتھ سے بائیں والے پیڑ کو اتنا جھنجھوڑتا کہ اس پر بیٹھے ہوئے پرندے مارے خوف کے شور مچاتے ہوئے پیڑ کے ارد گرد چکر کاٹنا شروع کر دیتے۔

جب اپنے شہ زور جسم کا کوئی بھی مناسب استعمال اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو ایک روز اُس نے سنتھا سنگھ سے کہا "اگلی بار تم لوگ چوری کرنے جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے جانا۔"

پہلے تو سنتا سنگھ اور اس کے ساتھی مانے نہیں۔ لیکن جب اس نے بہت زور دیا تو وہ اُسے ساتھ لے گئے۔ لیکن پہلی بار ہی اجیت سنگھ کے سر پر مصیبت آ گئی۔ ہوا یہ کہ انھوں نے اجیت سنگھ سے کہا کہ وہ لوگ تو حویلی کے اندر چوری کرنے جا رہے ہیں۔ وہ باہر کسی جگہ چھپ کر خیال رکھے کہ گھر والے جاگ تو نہیں گئے۔

اجیت سنگھ حویلی کے اُس حصے میں جہاں آنگن میں گائیں بھینسیں بندھی تھیں، آڑ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ سو گیا۔ اور پھر نیند اس وقت ٹوٹی جب ون کی روشنی میں گلی میں شور مچ گیا کہ چوری ہو گئی۔

اجیت سنگھ بڑبڑا کر اٹھا اور گلی کے لوگوں میں مل کر کھڑا ہو گیا۔ گاؤں والوں نے اپنے درمیان جب اس اجنبی کو دیکھا تو انھیں کچھ

www.taemeernews.com

شکست ہوا۔ اجیت سنگھ گھبرایا ہوا تو تھا ہی وہاں سے دو قدم پیچھے ہٹ کر سرپٹ بھاگ پڑا۔ اُسے بھاگتے دیکھ کر گاؤں کے لوگوں نے اس کا پیچھا کیا۔ دو میل تک متواتر دوڑتے رہنے پر بھی اجیت سنگھ پیچھا کرنے والوں سے کافی آگے تھا۔ اُدھر اُس کے ساتھیوں نے اپنے مخصوص اڈے پر پہنچ کر جب دیکھا کہ اجیت سنگھ وہاں نہیں ہے تو انھیں ڈر ہوا کہ کہیں انا ڈی اجیت سنگھ کی وجہ سے پکڑے نہ جائیں۔ اس لئے سنتھا سنگھ خود ایک ساتھی کو لے کر گھوڑیوں پر سوار گاؤں کی طرف آرہا تھا۔ جب انھوں نے اجیت سنگھ کے تعاقب میں گاؤں کے لوگوں کو آتے دیکھا تو وہ معاملے کی نوعیت بھانپ گئے۔ سنتھا سنگھ نے آگے بڑھ کر اپنی گھوڑی اجیت سنگھ کو دی کہ اس پر سوار ہو کر دفع ہو جائے اور پھر وہ خود دوسرے ساتھی کی گھوڑی پر سوار ہو کر نو دو گیارہ ہو گیا۔

لیکن اس پہلی واردات کے بعد اجیت سنگھ کی دھاک بیٹھ گئی سنتھا سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے جہاں اس کے سوجھ بوجھ پر لعنت ملامت کی وہاں اس کی ہمت کی بھی داد دی۔

پھر تو اجیت سنگھ بس اجیت سنگھ بن گیا۔ ساری عمر ایسی ایسی چوریاں کیں کہ کیا کوئی کرتا۔ وہ کبھی پکڑا نہیں گیا۔ چوری کا مال وہ کبھی گھر نہیں لاتا تھا ـــــ بلکہ اکثر وہ چوری کا مال بیچتا پہلے تھا۔ چوری بعد میں کرتا تھا۔ ایک بار اس نے ایک گھر کی چوری کا مال دو ہزار میں بیچنا منظور کیا، لیکن جب وہ چوری کرنے گیا تو بہت کچھ ہاتھ لگا

www.taemeernews.com

کوئی تیس ہزار کا مال تھا۔ مہاجن نے مال دیکھ کر اسے دو ہزار سے زیادہ دینا چاہا تو اجیت سنگھ نے انکار کر دیا۔ "نہ بھائی حرام کا مال اجیت سنگھ نہیں لیتا۔ تمہاری قسمت سے زیادہ آیا ہے سو تم کھاؤ۔"

بوڑھا ہو جانے پر جب اجیت سنگھ نے چوری کا دھندا چھوڑا تو اس کے پاس کافی رقم تھی۔ آٹھ دس سال وہ گھر بیٹھے کھاتا رہا۔ لیکن جب بچی بچائی رقم کم ہونے لگی تو اسے فکر ہونے لگی کہ جب سب سرمایہ ختم ہو جائے گا تو کہاں سے کھائے گا؟

اس قسم کے سوالوں کے جواب اگر اجیت سنگھ کو آتے ہوتے تو وہ بھلا چوری کا دھندا ہی کیوں شروع کرتا۔ اس لئے جب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو پھر گورو گرنتھ کے سامنے ماتھا ٹیکتے ہوئے وہ کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں کیا الفاظ کہے، یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن ان کا مفہوم یہی تھا کہ، "ہے واہگورو، ہے گورو مہاراج! ساری عمر کما کر تمہیں دیتا رہا ہوں۔ اب تم ہی میرا بندوبست کرو۔"

اسی لمحے اس نے دیکھا کہ جس جگہ جھک کر اس نے ماتھا ٹیکا تھا وہاں پانچ روپے کا ایک نوٹ پڑا تھا۔ جو شاید کسی شردھالو بھگت نے چڑھایا تھا۔

اجیت سنگھ کو جیسے روشنی مل گئی۔ اس نے کچھ ڈرتے ڈرتے وہ نوٹ اٹھا لیا اور بولا "واہ واہگورو! تو سچ مچ بڑا دیالو ہے!"

www.taemeernews.com

اس روز سے اب تک اجیت سنگھ پہلے سے بھی زیادہ عقیدت
کے ساتھ گوردوارے جاتا ہے، وہاں گوردوارے میں سیوا کرتا ہے
دریاں صاف کرتا ہے۔ جھاڑو دیتا ہے۔ واہیگورو! واہیگورو!"
کرتا ہوا لوگوں کے جوتے بھی اپنے ہاتھ سے صاف کرتا ہے ——
اداس کے ساتھ اپنے روز کے خرچ کے لئے چڑھاوے میں سے
کچھ نہ کچھ لیتے ہوئے کہتا ہے!" ہے واہیگورو، تو بڑا دیالو ہے
جو اپنے اجیت سنگھ کو روزی دے رہا ہے۔"

امداد

یہ آج ہی ہوا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے صبح کو۔
ایک ہونہار بچہ بڑے سرکار کے محل میں گیا۔ جہاں سے وہ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے مالی امداد حاصل کرنا چاہتا تھا۔
محل کے بڑے پھاٹک پر ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ اتنا بڑا پھاٹک اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ حیران و ششدر آنکھیں پھیلائے پھاٹک کی طرف دیکھتا رہا۔ جس کے بیچ میں ایک کشادہ صاف ستھری سڑک کافی دور بنی ہوئی عالی شان عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ بہت دیر بعد دل ہی دل میں وہ سارے فقرے جو وہ بڑے سرکار کے سامنے عرض کرنا چاہتا تھا کئی مرتبہ دہرانے کے بعد کچھ ہمت کر کے پھاٹک کے اندر داخل ہوا۔ اونچے اونچے پیڑوں کے زمین پر پھیلتے ٹھنڈے سایئے میں چلتا ہوا آخر محل کی عمارت کے پاس پہنچ کر اس نے قدرے اطمینان کی سانس لی۔
"جناب میں جماعت میں اول آیا ہوں اور..... اُس نے پھر وہ جملے

www.taemeernews.com

دہرانے کی کوشش کی۔ لیکن اسے محسوس ہوا جیسے جملوں کا تسلسل کچھ ٹوٹ رہا ہے اس تسلسل کے ٹوٹتے ہی اس کے معصوم ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ اور اپنی گبھراہٹ دور کرنے کے لئے اس نے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا تا کہ اگر کوئی دکھائی دے جائے تو اس سے درخواست کرے کہ وہ بڑے سرکار سے ملنے کے لئے حاضر ہوا ہے۔ اس کوشش میں اس نے عمارت کے سامنے والے برآمدے اور کوٹھی کے ایک طرف تین چکر لگائے تب کہیں جاکر اسے ایک بوڑھا سا آدمی دکھائی دیا۔ جو ایک پیڑ کے نیچے چارپائی پر بڑی بے نیازی سے بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔

اس بڈھے نے اس سے کئی سوال کئے۔ بڑے سرکار سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیا نام ہے؟ وہ تمھیں پہلے سے جانتے ہیں یا نہیں؟ تب کہیں جاکر وہ پہلے کھانسا۔ پھر اٹھا اور آہستہ آہستہ رینگتا ہوا لمبی مسافت طے کرکے آخر محل کے ایک دروازے میں غائب ہو گیا تا کہ بڑے سرکار کو چھوٹے بچے کے آنے کی اطلاع دی جا سکے۔

بچہ ایک طرف آگے بے صدا اونچے پیڑ کے نیچے اُمید اور نا امیدی کے سمندر میں غوطے لگاتا ہوا کوٹھی کے مختلف دروازوں کی طرف دیکھتا رہا اور اندازے لگاتا رہا کہ بڑے سرکار کس دروازے سے نمودار ہوں گے۔

وہ کھڑا رہا۔ اور انتظار کرتے کرتے اس نے پہلے محل کے نظر آنے والے دروازے گنے۔ پھر کھڑکیاں گنیں۔ پھر روشندان گنے۔ اتنی دیر بعد بھی بوڑھا واپس نہ آیا تو اس نے باغیچے میں لگے ہوئے پھولوں والے

www.taemeernews.com

بودے گئے، سڑک کے ساتھ ساتھ رکھے ہوئے پھولوں والے گملے گئے۔ کتنے ہی پودوں اور گملوں میں لگے ہوئے پھول گن ڈالے لیکن بڑے سرکار تو بڑے سرکار ان کے نوکر بوڑھے نوکر کی بھی آواز سنائی نہ دی بچہ اسی پیڑ کے نیچے کھڑا رہا اور انتظار کی گھڑیاں کاٹنے کے لئے وہ کافی دیر کنکروں سے نشانہ لگانے کا کھیل کھیلتا رہا۔ نشانہ لگ جاتا تو وہ خوش ہوتا اور سوچتا کہ بڑے سرکار سے مدد مل جائے گی۔ اور وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے گا۔ نشانہ چوک جاتا تو یہ سوچ کر اداس ہو جاتا کہ مدد نہیں مل سکے گی۔

جب پانچ چھ مرتبہ اس کا نشانہ چوک گیا تو مایوس ہو کر اس نے وہ کھیل بھی بند کر دیا اور مایوسی کے عالم میں کھویا ہوا خالی خالی نظروں سے محل کی طرف دیکھتا رہا۔

کافی دیر بعد جب بوڑھا کھانستے ہوئے واپس آیا تو وہ بچہ اس عرصے میں بچپن کی سرحدوں کو پار کر کے جوانی میں قدم رکھ چکا تھا۔

"بڑے سرکار ناشتہ کرنے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہی ملاقات ہو سکے گی" بوڑھے نوکر نے یہ جملہ کچھ اس طرح ادا کیا جیسے وہ یہ اطلاع کسی انتظار کرنے والے کو نہیں بلکہ اس محل کے کسی اونچے سے پیڑ کو دے رہا ہو۔ اور اس کے بعد وہ بڑی بے نیازی سے حقہ پینے میں محو ہو گیا۔

وہ انتظار کرتا رہا۔ اب کی اس نے وقت کاٹنے کے لئے جس پیڑ کے نیچے کھڑا تھا اسی کے چھوٹے بڑے تنے اور شاخیں گننا شروع کر دیا۔ وہ

www.taemeernews.com

تنے اور شاخیں رہ رہ کر ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو جاتیں اور اسے اکثر اپنی گنتی پھر سے شروع کرنی پڑتی۔ اوپر کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی گردن میں، اس کی پیٹھ میں اس کی آنکھوں میں درد ہونے لگی۔ لیکن وقت کاٹنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس لئے کبھی کبھی وہ پیڑوں اور تنوں کو چھو کر پتے گننا شروع کر دیتا۔ وہ کام اور بھی زیادہ مشکل تھا۔ جب اس کی گردن بہت درد کرنے لگی تو اسے احساس ہوا کہ کافی وقت ہو گیا ہے اب بڑے سرکار باہر آنے والے ہوں گے۔ اس نے منت سماجت کر کے ایک مرتبہ پھر بوڑھے نوکر کو اندر بھیجا۔ بوڑھے کے لئے پھر وہی لمبی مسافت وہ پھر اسی دروازے میں غائب ہو گیا۔

جب تک بوڑھا پھر لوٹ کر آئے تب تک انتظار کرنے والا اپنی جوانی کی عمر طویل کا فاصلہ طے کر کے بڑھاپے کی وادی میں داخل ہو چکا تھا۔ اب کی نوکر نے آ کر پھر اسی پیڑ کو بتایا کہ بڑے سرکار نے ناشتہ کر لیا ہے اور اخبار دیکھنے کے بعد ملاقات کے کمرے میں آنے ہی والے ہیں۔

وہ پھر مختلف دروازوں کی طرف باری باری دیکھنے لگا اور اندازے لگانے لگا کہ ان دروازوں میں ملاقات کے کمرے کا دروازہ کونسا ہو سکتا ہے؟ جب وہ کوئی اندازہ نہ لگا پایا تو پتہ نہیں کب اس کی نظر ایک ننھی سی چیونٹی پر پڑ گئی جو اپنے منہ میں چاول کا چھوٹا سا دانہ دبائے پیڑ پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ تھوڑا چڑھتی تو ضرور لیکن رہ رہ کر اس کے منہ سے وہ چاول چھوٹ جاتا تھا اور ہر مرتبہ اسے پھر زمین پر آ کر اپنا سفر دوبارہ

www.taemeernews.com

شروع کرنا پڑتا تھا۔

اور آخر ملاقات کا دروازہ کھلا پہلے دروازے پر ایک نوکر نمودار ہوا۔ پھر اس کے کچھ دیر بعد بڑے سرکار دروازے میں سجے دکھائی پڑے۔

لیکن اس دوران وہ طالب علم بڑھاپے کی منزل سے گزر کر موت کی وادی میں قدم رکھ چکا تھا۔

بڑے سرکار کے پوچھنے پر کہ ان سے ملنے کے لئے جو بچہ آیا تھا وہ کہاں ہے۔ بوڑھا نوکر کھانستا ہوا اور رینگتا ہوا ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد ہاتھ جوڑ کر بڑے سرکار سے بولا: "حجور وہ بچہ تو پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔۔۔ اور حجور پیڑ کے نیچے ایک بوڑھا پتہ نہیں کب اور کہاں سے مرنے کے لئے آ گیا اس پیڑ کے نیچے اس کی لاش پڑی ہے۔"

بڑے سرکار نے اپنے پیچھے کھڑے سکریٹری کی طرف دیکھا اور کہا "اس غریب کی تجہیز و تکفین کا انتظام ہماری طرف سے کر دیا جائے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ واپس محل کے اندر چلے گئے اور ملاقات کے کمرے کا دروازہ پھر بند ہو گیا۔

---

www.taemeernews.com

رُوح کا دَرد

یہ تو بری بات ہے کہ میں رشوت لیتا ہوں۔ میں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ یہ بھنگی اور پورٹر جن کو مشکل سے اسی اسی سو روپے کے درمیان تنخواہ ملتی ہے۔ وہ مجھے دینے کے لئے کیسے روپوں کا انتظام کرتے ہیں۔ جب تک وہ عرضی کے ساتھ دو روپے نہ دے جائیں تب تک میں ان کی چھٹی نہیں منظور ہونے دیتا ریلوے کا پاس لینا ہو تو دو روپے پر اگر کسی کو تبادلہ کروانا ہو تو میں دو تین سو روپے سے کم بات نہیں کرتا۔ مجھے دو سو کے لگ بھگ تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن اگر یہ اوپر کی رقم نہ ملے تو میرا گزارہ ہونا مشکل ہو جائے۔ اور پھر وہ بیچارے غریب۔۔

میں بھی کس سوچ میں پڑ گیا ہوں۔ مجھے اس طرح نہیں سوچنا چاہیئے۔ مسٹر درگا پرشاد تم اس طرح ہرگز نہ سوچو۔ اس طرح سوچا تو ساری بالائی آمدنی بند ہو جائے گی۔ لیکن میں کیا کروں آج

www.taemeernews.com

تو اس طرح سوچنے پر مجبور ہوں۔ خیالات ہیں کہ رہ رہ کر میرے ذہن میں امڈے چلے آرہے ہیں۔ آج میرا ضمیر میرے اندر کا درگا پرشاد بول رہا ہے۔ مجھے اس کی آواز سننا چاہیئے۔ یوں تو میرے اندر کے درگا نے ہر بار مجھے رشوت لینے سے منع کیا ہے۔ اکثر رشوت کے ڈبے پکڑتے وقت میرے ہاتھ کانپ گئے ہیں۔ ہر بار جب میں نے رشوت نہ دینے والے کو پریشان کرنے کے لئے صاحب سے کہہ کر یا صاحب کے سامنے غلط بیانی کر کے کسی غیر مناسب جگہ تبادلہ کروا دیا ہے تو ہر مرتبہ میرے اندر کے درگا پرشاد نے کہا ہے کہ "مسٹر درگا پرشاد تم بھی ریلوے کے ایسے ہی ملازم ہو۔ جیسا وہ پورٹر ہے۔ ریل کے چلانے میں اس کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے۔ جتنی تمہاری۔ اس لئے تم اسے پریشان نہ کرو۔ تم اپنے مفاد کے لئے اس کے ساتھ ناجائز سلوک نہ کرو۔" لیکن ہر بار میرے باہر کے درگا پرشاد نے اندر کے درگا پرشاد کو سننے سے انکار کر دیا۔ لیکن آج تو مجھے اس اندر کے درگا پرشاد کو سننا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس درگا پرشاد نے مجھے دفتر کی اس کرسی پر باندھ کے بٹھا دیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ جب تک تم میری پوری بات نہیں سن لوگے تب تک میں تمہیں اس سیٹ سے اٹھنے نہیں دوں گا عجیب بات ہے کہ میں اس وقت اٹھنا بھی چاہوں تو نہیں اٹھ سکتا اس جگہ سے۔ بڑے بابو کو بھی آج شاید مجھ سے کوئی کام نہیں ہے۔ وہی مجھے بلا لیں تو ان خیالات سے چھٹکارا تو ملے۔ لیکن وہ تو نہ جانے کب سے فائلوں کے

www.taemeernews.com

ڈھیر میں مصروف ہیں جیسے زندگی بھر انھیں اس کام سے فرصت ہی نہیں ملے گی۔

اس وقت الگو کھڑا ہے باہر اپنی چھٹی کی منظوری کی چٹھی لینے کے لئے صبح جب وہ اپنی عرضی میری بندھی ہوئی دو روپے کی رقم کے بغیر لایا تو میں نے ڈانٹتے ہوئے اسے جھوٹ ہی کہہ دیا تھا کہ تمھاری چھٹی ہی ڈیو نہیں ہے۔ لے جاؤ اپنی عرضی اور پھر اس کے یہ کہنے پر کہ "حضور ہم آپ سے باہر نہیں ہیں" میں کیسے مسکرا دیا تھا۔ مجرمانہ مسکراہٹ اس کے اشارے پر میں سمجھ گیا تھا وہ چھٹی کی چٹھی لیتے وقت مجھے میرا حق دے گا۔ حق، کیسا حق؟ کیوں نہیں۔ میں نے محنت نہیں کی؟ ریکارڈ دیکھ کر میں نے عرضی پر لکھا کہ الگو کی کتنی چھٹی ڈیو ہے۔ پھر اسے خود ہی صاحب کے پاس منظوری کے لئے لے گیا چھٹی منظور کروا کر کر بڑے بابو سے دستخط کروا لئے۔ دوسرے کاغذات کے ساتھ صاحب کے پاس بھجوا دیتا تو ابھی دس دن تک عرضی واپس ہی نہ آتی۔ اور وہ آج ہی چھٹی چاہتا تھا، آج ہی۔ قاعدے سے اس کی عرضی پندرہ دن پہلے آنی چاہیئے تھی۔ آخر اس کا محنتانہ بھی تو کچھ چاہیئے۔ کیا محنتانہ؟ یہ تو میرا فرض ہے اسی کام کی تو مجھے تنخواہ ملتی ہے اور پھر انسانی ہمدردی بھی تو کوئی چیز ہے۔ آخر الگو کو معلوم تھوڑے ہی تھا کہ اس کا مکان گر جائے گا۔ میں کس قدر ذلیل ہوں۔ مکان گرنے سے تو اس کا نقصان ہوا ہی اوپر سے چھٹی لینے کے لئے دو روپے مجھے دے،

www.taemeernews.com

ہاں، بیچ، عرضی کے ساتھ اس نے روپے کیوں نہیں دیئے۔ بعد میں کیوں، کہیں کوئی گڑبڑ گھٹالہ تو نہیں ہے نہیں۔ الگو کی اتنی ہمت نہیں ہوسکتی، اسے تو میں برسوں سے جانتا ہوں۔ اس کے پاس کھلے نوٹ نہیں ہوں گے۔ لیکن آج کل یہ سالی انیٹی کرپشن کی بھی نئی بیماری چل پڑی ہے، ہر وقت خطرہ ہی لگا رہتا ہے وہ بیچارہ دیوی داس پانچ سال تک معطل رہا۔ یہی غنیمت رہی کہ رشوت کا کیس بن نہ پایا۔ اور اسے دوبارہ نوکری مل گئی لیکن اس پانچ سال کے عرصے میں ہی وہ بوڑھا ہوگیا۔ ایسا ہی حشر میرا بھی ہوسکتا ہے۔ درگا پرشاد کے بچے یہ تمہارے لال لال ابھرے ہوئے گال پیلے پڑ جائیں گے اور جو بے عزتی ہوگی وہ الگ، ہوں! میں بھی کس سوچ میں پڑ گیا ہوں، کس کی ہمت پڑی ہے جو میرے ساتھ ٹکر لے، سالوں کے بھوسا بھر دل ناکوں چنے چبوا دوں۔ میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ اور انٹی کرپشن والے تو میرے سامنے بچے ہیں۔ یہ کسی کو گواہی دینے کے لئے تیار ہی نہیں کر پائیں گے اس لئے انٹی کرپشن والوں کا مجھے کیا ڈر، وہ تو دیوی داس ایسے بدھو کی بات دماغ میں آئی تھی۔ اس لئے میں نے اس طرح سوچنا شروع کر دیا۔ کہیں میں اس طرح خود کو دھوکا تو نہیں دے رہا نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ ہاں، ہاں میں یقیناً اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں۔ میرے دل میں بھی انٹی کرپشن والوں کا خوف سمایا رہتا ہے۔ اس دن سنیما شو کے ہاف ٹائم میں جب اچانک

www.taemeernews.com

میری نظر انیٹی کرپشن انسپکٹر پہ پڑی تو خوف کی ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ اس دن میں نے کوئی رشوت نہیں لی تھی۔ لیکن پھر بھی میں باقی شو سے لطف اندوز نہیں ہو پایا تھا۔ سارا مزا کرکرا ہو گیا تھا یہی سوچتا رہا تھا کہ یہ انسپکٹر میری سیٹ کے پیچھے کیوں بیٹھا ہے میرا دل چاہتا تھا کہ شو ختم ہونے سے پہلے ہی گھر چلا جاؤں لیکن اس لئے نہیں اٹھا کہ اس سے تو انسپکٹر کا شک یقین میں بدل جائے گا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ رشوت لینے کی وجہ سے پکڑے جانے کا ڈر ہر وقت میرے دل میں رہتا ہے۔ پچھلے مہینے جب میرے بھائی صاحب نے دعوت دی تھی۔ اپنی ترقی کی خوشی میں اس وقت ہر شخص خوش تھا صرف میں اداس تھا۔ میں نے ان ہی دنوں جمناداس سے تین سو روپے لئے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ صاحب سے کہہ کر اسکا تبادلہ کروا دوں گا۔ اس تبادلے کو منظور کروانے کے لئے صاحب کے سامنے غلط بیانی بھی کی تھی۔ اپنے نوٹ میں کچھ حقائق کو چھپایا تھا لیکن صاحب کو کسی نہ کسی طرح اصلیت کا پتہ چل گیا تھا صاحب نے مجھے بری طرح ڈانٹ بھی دیا تھا۔ پھر بھی میں ڈر رہا تھا کہ وہ میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں۔ اسی لئے میں بجھا بجھا سا تھا دعوت میں خوش کیا ہوتا خاک۔ دماغ تو فکر مند تھا۔ اسی ایک واقعہ کا ذکر کیا۔ اس طرح نہ جانے میں نے کتنی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا

www.taemeernews.com

ہے۔ یہاں تک کہ بچوں سے کھیلتے وقت بیوی سے پیار کرتے وقت میرے دل میں خوف کی ایک لہر سی اٹھتی ہے اور میری ننھی ننھی معصوم سی خوشیوں کو بہا کر لے جاتی ہے میں ہاتھ ملتا رہ جاتا ہوں اُن میں کس قدر مصنوعی طور پر زندہ ہوں۔ اندر سے کچھ باہر سے کچھ بظاہر خوش ہوتا ہوں اصلیت میں اداس ہوتا ہوں۔ یہ تو میں اپنے ساتھ دھوکا کر رہا ہوں، سراسر دھوکا میں دوسروں کو نہیں لوٹ رہا۔ بلکہ خود لٹ رہا ہوں مجھے سنبھلنا چاہیئے۔ اپنی اصلیت کو پہچاننا چاہیئے۔ پھر میری زندگی یقیناً خوشیوں سے بھرپور ہوگی۔ اب میں نے اپنی زندگی کے کتنے سال بیکار ضائع کر دیئے ہیں۔ جن میں میں حقیقی خوشیوں سے محروم رہا ہوں۔ دوسروں سے ان کی خوشیاں چھینی ہیں۔ میں مجرم ہوں، گنہگار ہوں لیکن بس .... اب میرا ایک بھی قدم غلط راستے پر نہیں اٹھے گا درگا پرشاد سنبھل چکا ہے۔ اس نے اپنے اندر کے درگا پرشاد کی آواز کو سن لیا ہے۔ اب میرا ظاہر اور باطن ایک ہوگا مکمل ایک! اس میں کوئی شبہ نہیں، کوئی گنجائش نہیں شک کی۔

وہ الگو دروازے سے اندر کی طرف جھانک رہا ہے وہ میرے اشارے کا منتظر ہے۔ مجھے اسے بلانا چاہیئے تاکہ وہ اپنی چھٹی لے جائے۔ میں اس سے دو روپے نہیں لوں گا آج سے بلکہ اسی وقت سے رشوت لینا بند۔ الگو دو روپے لے بھی آیا تو کہہ دوں گا۔ جاؤ دوست تم لوگوں کی سیوا کرنا تو میرا فرض ہے۔

www.taemeernews.com

میرا اشارہ پاکر الگو آرہا ہے۔ کتنا گھبرایا ہوا سا ہے۔ بیچارہ اس کی چٹھی کہاں ہے؟ دراز میں رکھی۔ تھی، ہاں یہ رہی۔ یہ پہلا لمحہ ہے جب میں بغیر رشوت لئے کسی کا کام کر رہا ہوں۔ یہ وہ لمحہ ہے جو میرے لئے خوشیوں کا پیغام لائے گا۔ اب سے میری آتما میرے اندر کا درگا پرشاد خوش رہے گا۔

الگو اپنی چٹھی لے کر چلا گیا ہے ـــــ لیکن میری مٹھی میں یہ دو روپے کا نوٹ کہاں سے آگیا ـــــ میں اپنی مٹھی بند کیوں کئے ہوں؟ میں اپنی انگلیوں کو توڑ کیوں نہیں دیتا ـــــ اپنی مٹھی کو کاٹ کیوں نہیں لیتا ـــــ لیکن یہ سب کروں کیسے؟ میں تو مردہ ہوں ـــــ مردہ ـــــ ٹھنڈی لاش جو کچھ نہیں کر سکتی۔

www.taemeernews.com

آٹھواں پتھر

ایک عرصے سے وہ سوچ رہا تھا کہ اب کم از کم اپنی بیوی کو تو وہ بتا ہی سکتا ہے کہ اس نے جوانی میں سات خون کیے تھے اور اگر وہ بھیس بدل کر اپنے آپ کو قانون کے شکنجے سے بچانے میں کامیاب نہ ہوتا تو چالیس سال پہلے پھانسی کے تختے پر جھول گیا ہوتا۔

وہ کامیابی، کامیابی نہیں ہوتی جس کا دوسرے اعتراف نہ کریں اس لئے اس کا یہ راز اس کے سینے میں بھاری بوجھ کی طرح رکھا تھا جسے وہ پچھلے چالیس برس سے اپنے اندر ہی اٹھائے اٹھائے گھوم رہا تھا۔

اگر کوئی ہلکا سا بوجھ بھی متواتر سر پہ رکھا رہے تو انسان تھک جاتا ہے ہر لمحے اس کا دل چاہتا ہے کہ اس بوجھ کو سر سے اتار کر سکھ کا سانس لے لیکن سینے کے اندر کے بوجھ کا وہ کیا کرتا؟ یہ بوجھ اٹھا کر ایک طرف نہیں رکھا جا سکتا، اور اسے کسی پر ظاہر کرنا اپنی

www.taemeernews.com

زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے برابر تھا۔

کسی غیر آدمی کو تو اس راز کو بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے تو اس راز کو اپنی بیوی سے بھی چھپایا تھا۔ جو پچھلے بیس برس سے اس کی شریک حیات تھی۔ ہاں جب کبھی یہ بوجھ اس کے دل و دماغ کے لئے برداشت سے باہر ہو جاتا تو وہ اپنی بیوی کے سینے میں اپنا سر چھپا کر دیر تک روتا رہتا تھا جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کے سینے میں سر چھپا کر روتا ہے۔ اس طرح رونے سے اس کا دل تو کچھ دیر کے لئے ہلکا ہو جاتا، لیکن اس کے سینے کا راز کبھی اس کی بیوی کے سینے میں منتقل نہ ہو پاتا۔ اس سے بس اُسے لمحاتی سکون ہی ملتا۔

اس طرح وہ برسوں پریشان رہا۔ اب وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ جوانی کے مقابلہ میں اب اس کا حلیہ بالکل مختلف ہو گیا تھا۔ محلے میں اس کی عزت تھی لوگ اُسے اچھا آدمی سمجھتے تھے۔ بیٹوں نے جوان ہو کر اس کے کام دھندے کو خوش اسلوبی سے سنبھال لیا تھا۔ اس لئے اب رہ رہ کر اس کے دل میں خیال آتا تھا کہ اگر وہ اپنا راز کم از کم اپنی بیوی کو ہی بتا دے تو زندگی کے آخری دن تو اس بوجھ کے بغیر کٹ جائیں۔

جس دن اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی بیوی کو وہ سب کچھ بتائے گا اس سے پہلی رات اس کے لئے بڑی اذیت کی رات تھی۔ وہ کالی رات

www.taemeernews.com

گئے تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ اسے اپنی بیوی کو ساری باتیں بتانی چاہئیں یا نہیں" اگر بتا دیں تو وہ میرے متعلق کیا سوچے گی۔ کہیں اس کے دل میں میرے لئے عزت کم تو نہیں ہو جائے گی۔ کہیں وہ میرے بچوں کو تو نہیں بتا دے گی۔ اور اگر ان کو پتہ لگ گیا تو؟ میں نہیں چاہتا کہ میرے بیٹوں کو میرے گھٹیا ماضی کا پتہ چلے.... نہیں نہیں، وہ اُن کو کبھی نہیں بتائے گی۔ میں جانتا ہوں اس کے دل میں میرے لئے بہت عزت ہے۔ اس نے ہمیشہ وہی کیا ہے جو میں نے اس سے کہا ہے.... اور پھر میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ اس بوجھ کو اور اٹھائے اٹھائے پھروں۔ جب بھی کبھی میں اپنے سینے میں اس بوجھ کو محسوس کرتا ہوں میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ کہیں اس بوجھ سے ایک دن میرا دل یکایک رک ہی نہ جائے۔ نہیں ابھی میں مرنا نہیں چاہتا۔ زندگی کا بڑا حصہ تو اذیتیں برداشت کرتے ہی گزر گیا۔ اب بھگوان نے سکھ دیا ہے تو میں اس سے آخری لمحوں تک زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانا چاہتا ہوں۔

اور آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اب اپنی بیوی کو یہ راز بتا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس فیصلے کے بعد وہ گہری نیند سو گیا۔ صبح اٹھا تو اپنے فیصلے پر اٹل تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس فیصلے سے ہی اسے اتنا سکون مل سکتا ہے تو اس پر عمل کرنے سے تو یقیناً بے انتہا راحت ملے گی۔

صبح کو وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر سیر کرنے نکلا دونوں دور پہاڑی

www.taemeernews.com

کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں اس نے اپنی بیوی سے بہت سی باتیں کیں۔ بچوں کی، ان کے بچپن کی، بڑے لڑکے کی شادی کی، بیوی کے مائیکے کی اور نہ جانے کیا کیا۔ لیکن کہیں اُسے کوئی نقطہ ایسا نہ ملا جہاں سے وہ اپنے دل کی بات کا سلسلہ جوڑ سکتا۔

اس کمزوری پر آخر اس نے بڑی مشکل سے قابو پایا۔ اب وہ ایک اُونچی جگہ کھڑے تھے جہاں ان کے پیچھے اونچا پہاڑ تھا اور گھاٹی کے نیچے دور ایک چھوٹی سی برساتی ندی تیزی سے بہتی جا رہی تھی۔ اس نے کہاں سے بات شروع کی اور کہاں ختم کی۔ اس کا اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ ہاں اگر اُسے کچھ پتہ تھا تو صرف یہ کہ جس طرح کوئی سپنے میں بولتا ہے۔ ویسے ہی اُس نے اپنی بیوی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ کیسے وہ برسوں سادھو کے بھیس میں در در کی خاک چھانتا رہا اور پھر کیسے اس نے اس زندگی سے اکتا کر ایک جگہ مزدوری شروع کی۔ کس طرح پیسے بچا کر دکان کھولی، اس سے شادی کی اور پھر.....

جتنی دیر تک وہ اپنی بات کرتا رہا۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات جاننے کی اُسے جرات نہیں ہو رہی تھی وہ بات کرتا رہا اور نیچے تیزی سے بہتی ہوئی ندی کی طرف دیکھتا رہا یہاں تک کہ بات ختم کرنے کے بعد بھی اس کی ہمت نہیں پڑی کہ بیوی کی نظروں سے نظریں ملائے۔

بات کب کی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے بعد نہ وہ بولا تھا اور نہ

www.taemeernews.com

اس کی بیوی۔ وہ تو نیچے بہتی ہوئی ندی کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن اس کی بیوی کیا سوچ رہی تھی یا کیا دیکھ رہی تھی اس کا اسے احساس نہیں تھا

جب وہ سر سے ٹوٹا تو چالیس سال سے اٹھایا ہوا پتھر تو اس کے سینے سے اُتر چکا تھا، لیکن ایک نیا زیادہ بھاری پتھر اس کے سینے کو اپنے بوجھ سے دبائے دے رہا تھا۔ وہ کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے سارے کا سارا پہاڑ اس پر گر پڑا ہو اور وہ اس کے بوجھ کے نیچے کچلا جا رہا ہو

گھر کی طرف اکیلے لوٹتے ہوئے اس کی نظریں زمین پر گڑی جا رہی تھیں۔ لاکھ چاہنے کے باوجود اُسے حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ نیچے بہتی ہوئی ندی کی طرف دیکھ سکے۔ جہاں اس کی بیوی کی لاش پتھروں سے ٹکراتی ہوئی بہے جا رہی تھی۔

www.taemeernews.com

پرچھائیاں

بیوہ مایا دیوی کے کمرے میں ان کے مرحوم شوہر کی ایک تصویر ہے۔ تیس سال کی عمر کا جوان خوبصورت چہرہ آنکھوں میں زندگی کی لو۔ ہونٹ کچھ اس طرح سے حرکت میں آئے ہوئے سے کہ جیسے ابھی بول پڑیں گے۔

شروع شروع میں مایا دیوی گھنٹوں اس تصویر کے سامنے بت بنی بیٹھی رہتیں آنکھوں کے راستے اپنی جوانی لنڈھاتی رہتیں۔ کبھی کبھی اس تصویر کو اٹھا کر چوم لیتیں۔ سینے سے لگا لیتیں۔ اور یہاں تک ہوا کہ اس تصویر کو سینے پر رکھے رکھے انھیں نیند آجاتی۔ لیکن اب کئی سال بعد مندر جانے سے پہلے وہ اس تصویر کے پاس اگر بتی جلا کر رکھ دیتی ہیں۔ مندر سے جو دو ایک پھول پرشاد میں ملتے ہیں وہ بھی اس تصویر کے پاس ہی لاکر رکھ دیتی ہیں۔ کبھی کبھی اس تصویر کے چوکھٹے پر تازہ پھولوں کی گندھی ہوئی مالا بھی ڈال دی جاتی ہے

www.taemeernews.com

ایک دن یہ ہوا کہ ان کی بہو نے یا پھر ان کے چھوٹے پوتے نے پتہ نہیں کس نے ان کے بیٹے کی تصویر بھی اسی شیلف پر لاکر رکھ دی۔ باپ بیٹوں کی ایک سی تصویر۔ ایک ہی عمر۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انکا شوہر ہی بیٹے والی تصویر میں چھپ کر بیٹھ گیا ہو۔ چند لمحے وہ دونوں تصویروں کو دیکھتی رہیں۔ پھر جب اگر بتی کا دھواں باپ کی تصویر کے اوپر سے تیرتا ہوا بیٹے کے چہرے پر پھیلنے لگا تو پتہ نہیں مایا دیوی کو کیا ہوا۔ ان کا وجود خوف سے کانپ گیا۔ پاؤں کے نیچے سے جیسے زمین سرک گئی۔ اسی گھبراہٹ میں انھوں نے جلدی سے بیٹے کی تصویر وہاں سے اٹھالی اور اسے پہلے اسی کمرے میں دوسرے شیلف پر رکھا وہاں رکھنے پر بھی جیسے ان کے دل کو چین نہ پڑا۔ اس لئے وہ اسے دوسرے کمرے میں رکھنے گئیں تو بیٹے کی تصویر کو کئی مرتبہ چوما۔ کئی بار گلے لگایا۔ اور جب وہ اسے دوسرے کمرے میں قرینے سے رکھ چکیں تو انھیں احساس ہوا جیسے وہ اپنے بیٹے کو موت کی پرچھائیوں سے چھڑا لائی ہوں۔

ابھی ان کے دل کی بے چینی دور ہوئی ہی تھی کہ پہلے کمرے میں لوٹتے ہی ایک اور خیال نے ان کے دل کو پریشان کر دیا۔ اپنے شوہر کی تصویر کی طرف نگاہ جاتے ہی جیسے ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شوہر کی نظروں سے نظریں ملا سکیں۔

ان کا شوہر جیسے تصویر کے فریم اور شیشے کو توڑ کر باہر نکل آیا ہو اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مایا دیوی ——— سے کہہ رہا تھا کہ اگر میں زندہ ہوتا

www.taemeernews.com

تو اپنے بیٹے سے کندھے سے کندھا ملا کر مجھے کتنی مسرت ہوتی اور آج ... آج تم مجھے اتنا حق بھی نہیں دیتیں کہ میرے بیٹے کی تصویر بھی میری تصویر کے ساتھ رکھی جا سکے۔ اگر انسان کے دل میں زندگی میں ہزاروں خواہشیں مچلتی ہیں تو مرے ہوئے آدمی کی زندگی کی تصویر کی تہوں میں کوئی ایک آدھ خواہش تو زندہ رہ ہی سکتی ہے۔ انسان مر جاتا ہے۔ خواہشیں تو نہیں مر جاتیں۔ تم بھی تو میری ایک خواہش تھیں اور تم ابھی تک زندہ ہو..... اٹھا لے جاؤ اپنی یہ اگربتی۔ اور یہ مندر کے لائے ہوئے پھول۔ اور مجھے نہیں ضرورت تمہارے اس ہار کی جو میری تصویر کے پرخچے سے لٹکا ہوا سوکھ رہا ہے۔ مرے ہوئے آدمی کو ان سب چیزوں کی کیا ضرورت ہے؟ اور تم میری اس تصویر کو برسوں سے اس شیلف پر کیوں رکھے بیٹھی ہو؟ اسے میری لاش کے ساتھ جلا کیوں نہیں دیا؟ میں پوچھتا ہوں۔ تمہیں اس لاش سے بدبو نہیں آتی؟

مایا دیوی اس کے آگے کچھ نہ سوچ پائیں۔ ان کی آنکھوں سے زندگی کی دھار بہنے لگی۔ وہ بھاگتی ہوئیں دوسرے کمرے میں گئیں۔ لڑکے کی تصویر اٹھائی۔ اور واپس آ کر باپ کی تصویر کے ساتھ رکھ دی۔ پھر دونوں تصویروں کو آمنے سامنے اس طرح جوڑا جیسے باپ بیٹے کو بغل گیر کروا رہی ہو۔ پھر دونوں تصویریں ساتھ ساتھ ٹکا کر رکھ دیں۔ اور زار زار روتی رہیں لیکن پھر اگربتی

www.taemeernews.com

کا دھواں باپ کے چہرے پر سے تیرتا ہوا جب بیٹے کی تصویر کی طرف جانے لگا تو وہ پھر لڑکے تصویر اٹھا کر دوسرے کمرے میں رکھ آئیں۔

اس طرح کئی دفعہ ہوا اور انھیں کسی طرح چین نہ پڑا۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ اگر بتی اسی طرح شوہر کی تصویر کے پاس صبح کو سلگا دی جاتی۔ مندر سے واپسی پر وہاں ایک دو تازہ پھولوں کا اضافہ ہو جاتا۔ مرجھایا ہوا پھولوں کا ہار پھینک دیا جاتا اور اس تصویر کے چوکھٹے پر تازہ ہار ڈال دیا جاتا۔ لیکن یہ پھول اور یہ ہار تصویر کی طرح ہی ساکت تھے۔ ساکت اور خاموش موت کی سی خاموشی۔

اور پھر ایک دن اس شیلف کو مایا دیوی نے پوری طرح جھاڑا کپڑے کے شیلف کی گرد بھی صاف کی۔ نیا کپڑا بچھایا۔ پرانے پھول اور ان کی سڑی ہوئی پتیاں پھینک دیں۔ ان کی جگہ مندر سے لائے ہوئے تازہ پھول رکھ دیئے۔ چوکھٹے کا ہار بھی تازہ ہی لایا گیا۔ تصویر کے میلے شیشے کو انھوں نے پانی لگا کر دوپٹے سے پونچھا اور شیشے کے پیچھے سے ان کے شوہر کا جوان چہرہ جھانکنے لگا۔

تصویر صاف کرتے ہوئے مایا دیوی کی نظر کمرے میں رکھے ہوئے سنگھار میز کے شیشے کی طرف چلی گئی۔ شیشے میں ایک اور مایا دیوی کسی تصویر کو صاف کر رہی تھی۔ مایا دیوی جس کا چہرہ جھریوں سے

www.taemeernews.com

بھرا ہوا تھا جس کے بال چاندی کی طرح سفید تھے۔ انھوں نے اُس مایا دیوی کی طرف سے نظریں ہٹا کر ایک نظر شوہر کی تصویر کی طرف دیکھا۔ تیس سال کی عمر کا جوان خوبصورت شوہر۔ انھوں نے اس تصویر کی طرف ایک لمحہ دیکھا۔ دو لمحے اور پھر ان کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا ... یہ شخص میری طرح بوڑھا کیوں نہیں ہوا؟ اس کے چہرے پہ جھریاں کیوں نہیں پڑیں؟ کیا یہ شخص میرا شوہر ہو سکتا ہے؟ شاید نہیں۔ میں اسے اپنا شوہر کیسے کہہ سکتی ہوں؟ یہ تو میرے بیٹے سے بھی چھوٹا ہے۔

اور پھر پتہ نہیں ان کے دل میں کیا آئی کہ وہ اس تصویر کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں اپنے بکس کے اندر بند کر کے رکھ آئیں۔

واپس آئیں تو خالی خالی سا شیلف دیکھ کر پھر ان کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ انھیں یوں لگا جیسے وہ ابھی ابھی بیوہ ہوئی ہوں اور ان کے شوہر کی جان ان کے دیکھتے ہی دیکھتے پتہ نہیں نکل کر کہاں چلی گئی ہے۔

وہ دوسرے ہی لمحے بکس سے وہی تصویر دوبارہ اٹھا لائیں اور آنکھوں میں آنسو بھرے پھر سے اسے اسی طرح سجا کر رکھنے میں مصروف ہو گئیں۔

---

www.taemeernews.com

لافانی نانک

ہندوستان اور پاکستان کی جب تقسیم ہوئی تو اس وقت آپس میں زمین بانٹی گئی، روپے پیسے اور جائیداد کی تقسیم ہوئی۔ لاکھوں آدمیوں، عورتوں اور بچوں کا بٹوارہ ہوا۔ یہاں تک کہ امرتسر کے ایک باشندے سعادت حسن منٹو کے مطابق دونوں ملکوں کے درمیان پاگلوں کا بھی تبادلہ ہوا۔ پاکستان سے ہندو اور سکھ پاگل ہندوستان بھیجے گئے اور ہندوستان سے مسلمان پاگل پاکستان بھیجے گئے۔

تقسیم کے اس موسم میں جب پنجاب میں خون کی آندھیاں چل رہی تھیں اور پنجاب کے زرخیز کھیتوں میں گیہوں کے بجائے انسانی لاشوں کی فصلیں اُگ آئی تھیں اور پنجاب کے پانچوں دریاؤں میں خون کی طغیانی آگئی تھی۔ اس وقت دونوں ملکوں کے درمیان گورو نانک کا بھی بٹوارہ ہوا۔

راوی کے اس پار ایک میل کے فاصلے پر بسا ہوا قصبہ کرتارپور جہاں

www.taemeernews.com

گورو نانک اپنی زندگی کے آخری دور میں کھیتی باڑی کیا کرتے تھے؛ پاکستان کے حصے میں آیا کیونکہ وہاں کے رہنے والے مسلمان نانک کو اپنا پیر اور بزرگ سمجھتے تھے۔ اور ہندوستان کے حصے میں دریائے راوی کے اس کنارے بسا ہوا قصبہ ڈیرہ بابا نانک آیا جہاں گورو نانک آخری عمر میں پوجا پاٹھ کیا کرتے تھے۔

گورو نانک کا معمول تھا کہ رات کو تاروں کی چھاؤں میں وہ اپنے کرتار پور کے کھیتوں سے چلتے، راوی میں اشنان کرتے اور راوی کے اس کنارے آموں کے ایک جھنڈ میں پہنچ کر گیان دھیان میں محو ہو جاتے۔ وہی جگہ بعد میں ڈیرہ بابا نانک کے نام سے یاد کی جانے لگی۔ گورو نانک وہاں رات بھر پوجا پاٹھ کرتے اور پھر صبح کے وقت واپس اپنے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے کرتار پور پہنچ جاتے،

تقسیم کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس زمین پر جہاں گورو نانک نے شانتی اور امن کے بیج بوئے تھے اور محبت کی فصل اُگائی تھی، وہاں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خون ریز لڑائی ہوئی۔

دونوں طرف کی فوجیں دن بھر ایک دوسرے پر آتش بازی کرتی رہیں۔ ہندوستان کی فوجوں کے لئے ڈیرہ بابا نانک کا سونے کے گنبد والا گوردوارہ بہت عزیز تھا، جو اس مقام پر بنا ہوا ہے۔ جہاں نانک بیٹھ کر پوجا پاٹھ کیا کرتے تھے۔ اس لیئے وہ اس

www.taemeernews.com

گوردوارے کی حفاظت (اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کر رہے تھے۔ اُدھر پاکستان کی فوجوں کو بیر نانک کا وہ گوردوارہ بہت عزیز تھا۔ جس میں گرو نانک کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بھی اپنے پیر کے اس متبرک مقام کو اپنے ہاتھوں سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔

نتیجے کے طور پر گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ وادی میں پانی کے بجائے خون بہہ رہا تھا۔ دونوں طرف جوان کٹ کٹ کر گر رہے تھے لیکن ایک انچ زمین چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔

ایسی ہی ایک بھیانک رات کو پاکستان کے مسلمان بریگیڈیر کے زمین دوز مورچے میں اردلی نے ایک بوڑھے کو پیش کیا، جسے ان کے سپاہی جاسوس سمجھ کر پکڑ کر لائے تھے۔ بوڑھے کے چہرے پر سفید داڑھی تھی اور وہ گھٹنوں تک لمبا چوغہ پہنے تھا۔

پاکستانی بریگیڈیر نے کڑک کر پوچھا۔ "تمہارا نام ہے؟"

"نانک"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"کرتارپور کا"

"کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ کرتارپور میں تو کوئی ہندو نہیں رہتا۔"

"میں رہتا ہوں۔ یہاں میرے کھیت ہیں۔"

"تم ہمیں اُلو نہیں بنا سکتے، یہ سمجھ لو کہ یہاں جھوٹ کی سزا موت ہے"

"اس کی تلاشی لی ہے۔ سپاہی"؟

www.taemeernews.com

"تلاشی میں تو کچھ نہیں نکلا سرکار۔ لیکن یہ ضرور ہمارے ٹھکانوں کی خبر لے کر دشمن کو بتانے جا رہا ہے۔"

"وہ تو ہے ہی۔ اور اس کی سزا موت ہے۔"

اور پھر بریگیڈیر نے خود اٹھ کر نانک کو گولی مار دی۔

خون کی ایک دھار ڈیرہ بابا نانک کی طرف بہہ نکلی۔ جیسے اسے پوجا پاٹھ کی جگہ پہنچنے کی جلدی ہو۔

اسی رات کے آخری پہر کے وقت ہندوستانی بریگیڈیر کے زمین دوز مورچے میں ایک سپاہی داخل ہوا اور بولا۔

"سر ہم لوگوں نے اک جاسوس پکڑا ہے۔ حکم ہو تو حاضر کیا جائے وہ پاکستان کی طرف جا رہا تھا کہ ہم نے پکڑ لیا۔

بریگیڈیر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ کہ شاید اس سے دشمن کے منصوبوں کا کچھ پتہ لگ سکے۔ اس نے جاسوس کو پیش کرنے کا حکم دیا۔

دوسرے لمحے ایک بوڑھا آدمی جس کے چہرے پر لمبی سی سفید داڑھی تھی اور جو گھٹنوں تک لمبا چوغہ پہنے تھا۔ سپاہیوں میں گھرا ہوا اس کے سامنے حاضر کیا گیا۔

"اپنا نام بتاؤ؟" بریگیڈیر نے کڑک کر پوچھا۔

"نانک"

"سچ بول رہے ہو؟"

www.taemeernews.com

"ہاں"
"کہاں کے رہنے والے ہو"
"ڈیرہ بابا نانک کا"
"کیا کام کرتے ہو"
"فقیر آدمی ہوں۔ یوجا پاٹھ کرتا ہوں"
"پاکستان کی طرف کیا کرنے جا رہے تھے؟"
"وہاں میرے کھیت ہیں کرتار پور میں"
پاکستان میں۔ اور تمہارے کھیت۔ تم نے ہمیں اُلو سمجھ لیا ہے کیا؟ سچ سچ بتاؤ۔ دشمن کو کیا بھید دینے جا رہے تھے"
"کوئی بھی نہیں"
"دشمن کے لئے جاسوسی کرتے تمہیں شرم نہیں آتی۔ سنتری اسکی تلاشی لو"
"تلاشی تو ہم لے چکے سرکار۔ اس کے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ لیکن یہ ہے ضرور جاسوس ہی"
"وہ تو میں بھی سمجھتا ہوں۔ اور اس کی سزا موت ہے"
اس طرح نانک کو ہندوستانی بریگیڈیر نے گولی مار دی۔ بوڑھے نانک کے خون کی دھار کرتار پور کی طرف بہنے لگی۔ جیسے اپنے کھیتوں میں پہنچنے کے لئے بے چین ہو۔
گورو نانک کی وفات کے بعد ایک معجزہ ہوا تھا۔ مسلمان کہتے

www.taemeernews.com

تھے۔ نانک ہمارا پیر ہے۔ ہم اس کی لاش کو دفنائیں گے۔ ہندو کہتے تھے۔ نانک ہمارا گورو ہے۔ ہم اس کی لاش کو جلائیں گے۔

جھگڑا بڑھا تو ایک کہاوت کے مطابق نانک کی لاش ہی وہاں سے غائب ہو گئی تھی اور آخر نانک کے کفن کے دو حصے کیے گئے آدھے کفن کو مسلمانوں نے بڑے احترام سے دفنایا تھا اور آدھے کفن کو ہندوؤں نے جلایا تھا۔

اس دن بھی یہی ہوا۔ اگلی صبح نانک کی لاش کسی کو نہ مل سکی البتہ ڈیرہ بابا نانک اور کرتار پور کی فضاؤں میں نانک کے شبد گونج رہے تھے۔

اول اللہ نور اُپایا قدرت کے سب بندے
ایک نور تے سب جگ اپجیا کون بھلے کو مندے

---

www.taemeernews.com

ایک پُرانی کہانی

اس پیلے، زرد کمزور چہرے پر بھوک تحریر تھی۔ دوسرے چہرے کے ماتھے سے درد پسینہ بن کر ٹپک رہا تھا۔ تیسرے چہرے پر اُس کی مجبوری نقش تھی۔ پھر چوتھا چہرہ پڑھا پھر پانچواں۔ پھر دسواں۔ پھر ہزاروں چہرے ایک کے بعد ایک تیزی سے میرے گرد گھومنے لگے۔ سب چہروں کی تحریریں پڑھتے پڑھتے ان کے دکھ درد کے احساس سے روح لرز گئی اور مجھے ایک پُرانی کہانی یاد آنے لگی۔

یہ کہانی اسی دھرتی کی تختی پر لکھی تھی۔ ہوسکتا ہے۔ آپ نے بھی پڑھی ہو۔ میں نے بھی اپنے بچپن میں پڑھی تھی۔

بات کچھ یوں ہے کہ ایک دفعہ ایک غریب آدمی کو فاقوں کی نوبت آ گئی۔ پوری محنت کے باوجود اسے اور اس کی بیوی کو پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ دن بدن وہ کمزور ہونے لگے ان کے چہرے بھی زرد پڑ گئے اور ان پر بھوک درد اور مجبوری موٹے موٹے لفظوں

www.taemeernews.com

میں تحریر ہو گئی۔

حالانکہ یہ تحریر کافی موٹے اور صاف لفظوں میں تھی لیکن ان کی بدقسمتی کہ اسے نہ تو ان کے اڑوسیوں پڑوسیوں میں سے کسی نے پڑھا نہ ان کے رشتے داروں اور دوست ہی پڑھ پائے۔ نہ ہی گاؤں کے مکھیا تک وہ تحریر پہنچی اور نتیجے کے طور پر جب ان کو روٹی کھانے کو نہ ملی تو ایک روز موت نے ان دونوں کو کھا لیا۔

ان کے مرنے کی دیر تھی کہ اس کے ایک پڑوسی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اسے دل ہی دل میں ندامت ہو رہی تھی کہ اس کے پڑوس میں وہ لوگ بھوکے مر گئے اور وہ ان کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس نے دوسرے پڑوسیوں سے بات کی۔ انھیں بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس لئے وہ سارے پڑوسی مل کر گاؤں کے مکھیا کے پاس گئے اس کے سامنے انھوں نے ہاتھ جوڑ کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور کہا کہ وہ اس جرم کے لئے سزا بھگتنے کو تیار ہیں۔

مکھیا نے فوری طور پر پنچایت بلائی۔ اور پنچایت میں سرپنچ اس فیصلے پر پہنچا کہ کیونکہ سارے گاؤں کی بہبود کی ذمہ داری اس پر ہے اس لئے ان مظلوموں کے لئے وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھتا ہے اور اس کے لئے اسے سزا ملنی چاہیئے۔

نتیجے کے طور پر سرپنچ ضلع افسر کے پاس گیا۔ ضلع افسر نے کہا کہ یہ تو بہت ظلم ہو گیا۔ میرے ضلع میں کوئی بھوکا مر جائے اور مجھے

www.taemeernews.com

کانوں کان خبر نہ ہو۔ یہ تو میرے انتظام کی خرابی ہے۔ غلطی میری ہے اور سزا مجھے ملنی چاہیئے۔

کہانی چونکہ آپ کی پڑھی یا سنی ہوئی ہے اس لئے بات کو مختصر کرتا ہوں۔

ہوتے ہوتے یہ بات صوبے کے گورنر اور پھر حکومت کے وزیر اور آخر کار بادشاہ وقت تک پہنچی اور کہتے ہیں کہ سب کی طرح بادشاہ نے اپنے راج کے دور دراز گاؤں میں فاقے کی موت کو اپنی ذاتی غلطی تسلیم کی اور سزا کے طور پر راج پاٹ تیاگ دیا اور جنگلوں کی راہ لی۔

لیکن اس وقت میں اس کہانی کو کیوں لکھ رہا ہوں۔ میرے گرد ہزاروں لاکھوں چہرے طواف کر رہے ہیں۔ ان کے چہروں پر جو بھوک تحریر ہے جو درد ٹپک رہا ہے وہ مجھے یہ کہانی دہرانے کے لئے مجبور کر رہا ہے کوئی اس کہانی کو پڑھ کر ان بھوکوں کے پڑوسیوں، دوستوں، رشتے داروں یا گاؤں یا شہر کے کھیا یا پھر حکومت وقت تک پہنچا دے تو ہو سکتا ہے ان کے چہروں سے بھوک اور درد کی تحریر مٹ جائے

www.taemeernews.com

الف سے آم

میرے لئے مولوی امام دین کا تصور ایک بہت لمبے، نہایت اونچے بلکہ سب سے لمبے سب سے اونچے شخص کا تصور ہے۔

تین سال کی عمر میں ان کے پاس کھڑے ہو کر ان کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے مجھے اپنی گردن بوری طرح اوپر کی طرف اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنا پڑا تھا، جہاں ان کی سفید پگڑی کا طرہ فضا میں لہراتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اور جب ان کی انگلی تھامے ہوئے میں اسکول کی طرف جا رہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی تمام اونچائی اور بلندی میرے ننھے سے جسم میں تحلیل ہو رہی ہو منتقل ہو رہی ہو۔ تبھی تو میں اپنے آپ کو اونچا اونچا سا محسوس کر رہا تھا۔ میرے پاؤں زمین پر پڑ ہی نہیں رہے تھے۔

اور جب انھوں نے مجھے علم و دانش کا پہلا درس دیا۔ الف سے آم۔ تو میں نے الف سے آم۔ الف سے آم کا ورد کرتے ہوئے یوں

www.taemeernews.com

محسوس کیا جیسے میرا ننھا سا قد بڑا ہو کر اسکول میں لگے ہوئے آم جتنا بڑا ہو گیا ہو۔ بڑا سا آم۔ اونچا سا۔ جس پر ڈھیروں بڑے بڑے اور میٹھے آم لگتے تھے اور جس کے پتوں کی سرسراہٹ میں گیتوں کی سی گونج تھی۔

جب مجھے الف سے آم یاد ہو گیا تو مولوی امام دین نے بتایا کہ جس الف سے آم ہوتا ہے۔ اسی الف سے اللہ ہوتا ہے۔ اللہ جو آسمان پر رہتا ہے۔ اور اسی لمحے میرا قد زمین سے اٹھ کر آسمان کو چھونے لگا۔

پہلے ہی دن اپنے ننھے سے قد میں آسمان کی بلندی سموئے جب میں اپنے گھر کے دروازے پر آیا تو مجھے احساس ہوا کہ میرا آسمان جتنا لمبا وجود گھر کے اس ننھے سے دروازے سے اندر کیسے جا سکے گا؟ تبھی میں نے دیکھا کہ وہ دروازہ جھک کر مجھے سلام کر رہا تھا۔ اس کی تعظیم سے متاثر ہو کر میں نے بھی اپنی بلندی کو سمیٹا تختی لٹکاتا ہوا گھر کے آنگن میں داخل ہو گیا۔

مولوی امام دین قد کا لمبا تو تھا ہی۔ لیکن جب وہ جماعت میں کھڑے ہو کر درس دیتا تھا کہ سچ کیا ہے۔ کتنا بڑا ہے۔ ایمانداری اور محنت کی کیا قیمت ہے۔ تب اس کا قد بہت ہی اونچا ہو جاتا تھا اور میں سمجھا کرتا تھا کہ کوئی آواز ہے جو آسمان سے آ رہی ہے۔ کوئی پیغام ہے جو زمین پر اتر رہا ہے۔ اور یہ آواز سنتے سنتے یہ پیغام

www.taemeernews.com

سنتے سنتے میرا قد بڑا ہونے لگا۔ پہلے میں اپنے بڑے بھائی سے لمبا ہو گیا۔ پھر اپنی ماں سے لمبا ہو گیا اور جب میں اپنے باپ سے بھی لمبا ہو گیا تو میرے گھر کا دروازہ جھک کر مجھے خوش آمدید کہنے لگا مجھے بھی اس میں سے گزرتے ہوئے سر جھکانے میں ایک فخر محسوس ہوتا تھا۔

ایک شام اپنے لمبے قد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جب میں اپنے اسم کے پیڑ سے توڑ توڑ کر رس بھرے آم کھا رہا تھا تو ایک اونچی سی ٹہنی سے آم توڑنے کے لئے مجھے اوپر کی طرف کودنا پڑا۔ جب میرا جسم ہوا میں معلق تھا تب وہاں سے آسمان بہت ہی قریب قریب سا لگا۔ جہاں مولوی امام دین کا طرہ لہرا رہا تھا۔ ستاروں کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کا چہرہ نور میں نہایا ہوا تھا اور ہونٹ یوں ہل رہے تھے جیسے ستاروں کو سچائی کا درس دے رہے ہوں۔ اس درس کو سننے کے لئے میں بھی آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا اور جب میں واپس لوٹا تو میری پگڑی میں بہت سے ستارے جگمگا رہے تھے اور میرا چہرہ ان کے نور کی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

اس شام کو جب میں گھر میں داخل ہوا تو زندگی میں پہلی بار ایک تلخ حقیقت کا سامنا ہوا۔

اس دن میرے بڑے بھائی کو ایک بڑی نوکری مل جانے کی

www.taemeernews.com

پہنچی آ ئی تھی۔ گھر کی دیواروں کی اینٹیں بھی اس خوشی کے موقعے پر مسکرا رہی تھیں۔ میں بھی خوش تھا۔ بار بار بھاتے بھاتے بڑے بھائی صاحب کے پاس جاکر کھڑا ہوتا تھا تو مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے بڑا آدمی ہو جانے پر میں بھی بڑا ہو گیا ہوں میرا قد اور بھی لمبا ہو گیا ہے۔ اور میری پگڑی پر اور بھی تارے ٹانک دیئے گئے ہیں۔ عین اسی وقت میرے بڑے بھائی نے ہاتھ مار کر میری پگڑی گرا دی اور کہا: "اسے ابھی تک پگڑی باندھنی بھی نہیں آئی"۔ اس دن انھوں نے مجھے اپنے ساتھ باہر لے جانے سے بھی انکار کر دیا تو مجھے لگا جیسے میرا قد چھوٹا ہو گیا ہو، میرا وجود گھٹنا شروع ہو گیا ہو۔

بھائی کے گھر سے چلے جانے کے بعد میں کتنی دیر اپنے گھر سے باہر گلی میں ٹہلتا رہا۔ وہاں ٹہلتے ٹہلتے جب میں اپنے گھر کے دروازے پر آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اب گھر کا دروازہ میرے لئے پہلے کی طرح جھک نہیں رہا ہے۔ اور وہ بہت اونچا ہو گیا ہے۔ میرے قد سے کہیں زیادہ اونچا۔ تبھی میں نے اپنے ارد گرد گلی کے مکانوں کی طرف دیکھا تو احساس ہوا کہ سب کے سب مکان پہلے کی نسبت بہت اونچے ہو گئے ہیں۔ فیض کا مکان نبو ادی کے گھر کا حصہ، ہر نام کے گھر کی باہری دیوار۔ سبھی کے سبھی اتنے اونچے ہو گئے ہیں کہ میں خود کو ان کے سامنے بونا سا محسوس کرنے لگا۔

www.taemeernews.com

بونا ہو جانے کے احساس سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنے
آم کے پیڑ پر چڑھ کر اس کی سب سے اوپری شاخ پر بیٹھ کر میں
کتنی دیر دور آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن وہاں نہ تو مولوی امام
دین کی پگڑی کا طرہ تھا۔ نہ کوئی چاند نہ ستارے۔ نہ سورج۔ پتہ نہیں
آسمان میں کیسا خلا پیدا ہو گیا تھا۔

اس رات میں گھر پہنچ کر بہت دیر جاگتا رہا اور اپنے قد کو
اونچا اٹھانے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ آخر میری آنکھوں کے سامنے
مولوی امام دین کا لمبا قد آیا۔ آسمان کی بلندیوں سے چھوتا ہوا ان
کی پگڑی کا طرہ چمکا۔ ستاروں کو درس دیتے ہوئے ان کے ہونٹ
ہلے اور مجھے ایک راستہ دکھا گئے۔

اگلے دن صبح ہی میں اپنے مختصر جسم پر سج کے کپڑے پہن کر
نکل کھڑا ہوا اور تب سے بڑی ایمانداری سے زندگی کی ڈگر پر بڑی
ثابت قدمی سے چل رہا ہوں۔ وہ دن اور آج کا دن۔ میرے قد
میں اضافہ تو خیر کیا ہوتا۔ دن بدن عمر کی طرح گھٹتا ہی چلا جا رہا ہے

اس بیچ ہرنام جو پچھلے درجے سے آگے نہیں بڑھ پایا اور
جو مولوی امام دین کی لمبائی کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ بلیک کے
روپے سے شہر کا رئیس اعظم بن گیا ہے۔ اور اس نے اپنے مکان
کو اتنا اونچا کر لیا ہے کہ اس کے سائے میں چلتے ہوئے مجھے لگتا
ہے جیسے جیتے جی پاتال میں پہنچ گیا ہوں جہاں زندگی کا کوئی وجود

www.taemeernews.com

تھیں۔ اور فیض کے تو کیا کہنے۔ مار دھاڑ میں وہ بچپن سے ہی نچھا کر تھا۔ کوئی کہتا ہے سونے کا دھندہ کرتا ہے مجھے نہیں معلوم میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس نے اتنا عالی شان مکان بنوایا ہے کہ اس پر کسی محل کا گمان ہوتا ہے اور اس محل تک پہنچنے کے لئے جو اس نے پھاٹک بنوایا ہے اس کے دونوں طرف دو بڑی بڑی مچھلیاں بنائی گئی ہیں۔ پتہ نہیں۔ ان مچھلیوں کو دیکھ کر مجھے کیوں ڈر لگتا ہے۔ رہ رہ کر خیال آتا ہے کہیں یہ مچھلیاں مجھے یا میرے مکان کو نہ نگل لیں۔ اسی لئے فیض کے گھر کے سامنے سے بہت محتاط ہو کر گزرتا ہوں۔ اور اس کے برعکس جب فیض ادھر سے گزرتا ہے تو وہ پھاٹک جھک کر اسے سلام کرتا ہے۔ مچھلیاں تعظیم بجا لاتی ہیں۔ ان کے اپنے گھر کا پھاٹک تو انہیں سلام کرے گا ہی میں نے تو بڑے بڑے افسروں، بڑے بڑے عالموں کو بھی ان پڑھ ہر نام اور فیض کے سامنے سر جھکاتے دیکھا ہے۔ اور تو اور جب یہ دونوں کسی بڑے سرکاری دفتر میں جاتے ہیں تو ان دفتروں کی عالی شان عمارتیں بھی جھک کر ان کی تعظیم بجا لاتی ہیں اور ہر نام اور فیض کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔

اس عرصے میں میرا قد چھوٹا ہوتے ہوتے ذرے کی طرح مختصر ہو گیا ہے۔ اسی حالت میں ایک دن میں مولوی امام دین کی قبر پہ بھی گیا تھا۔ لیکن بہت کوشش کے باوجود اس کا کوئی نشان نہیں ملا

www.taemeernews.com

البتہ فیض کے ابا کی پختہ قبر ضرور دکھائی پڑی تھی۔

اب رات کے سناٹے میں دور آسمان کی طرف اداسی کے عالم میں گھور رہا ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ شاید کوئی ستارہ، کوئی چاند کوئی سورج یا مولوی امام دین کی پگڑی کا طرہ چمکے۔ لیکن عجیب خلا پیدا ہو گیا ہے۔ آسمان کوری تختی کی طرح خالی ہے۔

ایک دفعہ پھر مولوی امام دین کی قبر تلاش کرنے کے لئے جاتا ہوں۔ اگر مل جائے تو اٹھا کر کہوں آسمان کی کوری تختی پہ ایک بار پھر وہ درس لکھ دو۔ الف سے آم ہو سکتا ہے۔ چاند یا ستاروں یا سورج کی روشنی میں کوئی اس پرانے درس کو پھر پڑھنا چاہے تو پڑھ لے۔

لیکن۔ لیکن اگر مولوی امام دین کی قبر مجھے مل بھی گئی اور وہ موت کی گہری نیند سے جاگ بھی گیا۔ اس نے آسمان کی کوری تختی پر الف سے آم لکھ بھی دیا تو کیا ہو گا؟ اسے پڑھے گا کون؟ اسے پڑھائے گا کون؟

---

www.taemeernews.com

پیغام

بموں کی بارش ہو رہی تھی۔
فضا میں چاروں طرف جیسے آگ سی لگی تھی۔ زور کا ایک دھماکا ہوتا۔ کوئی آگ کا گولہ زمین کے سینے کو چیرتا ہوا اندر تک دھنس جاتا تو درد کے مارے زمین زور سے چلا اٹھتی چیخیں کراہتی اس کے جسم کے ٹکڑے کٹ کٹ کر تڑپتے ہوئے فضا میں اچھلتے لیکن اس سے پیشتر کہ وہ واپس زمین پر گریں۔ ایک اور دھماکا ہوتا اور ایک مرتبہ پھر آگ فضا کو جلانے میں مصروف ہو جاتی۔

اس دھواں دھار ماحول میں ایک دن ایک معجزہ ہوا۔ اچانک فضا میں برف کے گالوں کے رنگ کی دو لکیریں ابھریں۔ لوگوں نے سمجھا دشمن کے بمبار جہاز رفتار کی حدوں کو توڑ کر آگے بڑھ رہے ہیں ابھی وہ کسی جگہ بموں کی بارش شروع کر دیں گے۔ لیکن دو لکیریں جب آہستہ آہستہ تیرتی ہوئیں زمین کے قریب آئیں تو پتہ چلا کہ وہ چاندی

www.taemeernews.com

کے رنگ کے لمبے لمبے دو بازو تھے۔ ان دو ہاتھوں کو زمین کے اور قریب آتا دیکھ کر پہلے سے دہشت زدہ لوگ ڈر کے مارے کانپنے لگے کہ جنگ کی مصیبت میں تو پہلے ہی پھنسے ہیں۔ یہ کونسی بلا نازل ہو گئی۔

لوگوں میں غیر متوقعہ خوف دہر اس پھیلتا دیکھ کر ماحول میں نہایت لطیف سی آواز کچھ اس طرح ابھری جیسے الہام ہو رہا ہو۔ وہ پیغام جب سنائی دینے لگا تو انھوں نے سنا۔ وہ آواز کہہ رہی تھی۔

"اے جنگ کی ستائی ہوئی زمین تو سن اور اپنے لوگوں سے کہہ کہ میں تو تیرے لئے محبت کا پیغام لے کر آئی ہوں۔ میں حدود کعبہ ہوں۔ اللہ کے حکم سے سینکڑوں سالوں سے کسی ظالم کی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ میری حدود کو انسانی لہو بہا کر ناپاک کرے۔ اللہ سب ظالموں کو سزا دینے والا ہے۔ اور وہ اپنے بندوں پر رحم کرنے والا بھی ہے۔ اس لئے مجھ سے تمہاری یہ مصیبت برداشت نہیں ہو پائی۔ تو اٹھ اور چل اور میری حدود میں پناہ گزیں ہو جا۔ وہاں کوئی تیرا بال بیکا نہ کر سکے گا۔"

اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ سچ کہا ہے۔ میں تیرے ایک بچے کو اٹھا کر اپنی حدود میں لے جاتی ہوں پھر تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خدا کس طرح اپنے بندوں کو بچاتا ہے۔

www.taemeernews.com

یہ کہتے ہوئے چاندی رنگ کے ان بازوؤں نے آن کی آن میں ایک بچے کو زمین سے اٹھایا اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ حدود کعبہ کی طرف لوٹ گئے۔

دشمن کے ایک بمبار جہاز نے اپنے شکار کو اس طرح بچ کر جاتے دیکھا تو اس نے ان ہاتھوں کا پیچھا کیا۔ لیکن کعبے کی حدود کے عین باہر وہ ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔

اسی لمحے وہ آواز پھر جنگ کی ماری زمین کے ماحول میں ابھری وہ کہہ رہی تھی۔

اسی لئے میں کہتی ہوں۔ اے جنگ و جدل کے ستائے ہوئے لوگو۔ آؤ۔ اور کعبے کی حدود میں داخل ہو جاؤ۔ اسی میں تمہاری بہبودی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کی حفاظت کرنے والا ہے۔ اور اے دنیا والو۔ اگر کعبے کی حدود میں شامل نہیں ہو سکتے تو اپنے ملکوں کی حدوں میں ایک ایک حدود کعبہ بنالو۔ جس بھی خدا کو تم مانتے ہو اسی کے گھر کو کعبہ تسلیم کر لو۔ اور اس کعبے کی ایک حد مقرر کر لو۔ اس کعبے کی حد میں کوئی قتل و خون نہ ہو۔ کیونکہ خدا قتل و خون کو پسند نہیں کرتا۔ اس طرح وہ سب حدیں مل کر میری حدوں سے مل جائیں گی۔ اور پھر ساری دنیا حدود کعبہ میں بدل جائے گی۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر تم سب لوگ امن اور چین سے رہ سکو گے۔ اسی سے تمہارا خدا تم سے خوش ہو گا۔"

www.taemeernews.com

اور اے دنیا کے ستائے ہوئے اور دکھوں کے مارے ہوئے لوگو
میں اوپر سے دیکھ رہی ہوں کہ زمین پریشانی کے عالم میں شمال سے
جنوب تک ایک سرے سے دوسرے سرے تک یوں بھاگ رہی
ہے جیسے کبھی صفا و مروہ کے درمیانی فاصلے میں حضرت ہاجرہ
دوڑتی رہی تھیں۔ اور تم لوگ جو زمین کے اسمٰعیل ہو، ایڑیاں
رگڑ رہے ہو اور زم زم پھوٹ نہیں رہا ہے۔

زم زم تبھی پھوٹے گا جب تمام دنیا کعبے کی حدود میں بدل
جائے گی۔ کعبے کی حدود جو پاک و متبرک ہے۔ جہاں ایک انسان
دوسرے انسان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگتا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ چاندی کے بازو چاروں طرف یوں پھیلنے
لگے۔ جیسے ساری دنیا کو اپنے احاطے میں لینے کی کوشش کر رہے
ہیں۔

www.taemeernews.com

لیر

بھوک تو اس بائل کو کب کی لگی تھی اور بہت زور کی لگی تھی لیکن وہ گول چاند کا قطر ناپنے میں اس قدر محو تھا کہ اپنی بھوک کے متعلق سوچ ہی نہیں رہا تھا۔

اس نے ہاتھ کی لیر کو چاند کے قطر پر پھیلا دیا۔ ایک آنکھ آدھی بند کی۔ دوسری آنکھ سے قطر کے دونوں طرف لیر کے سروں کو باری باری دیکھنا شروع کیا۔ اسے احساس ہوا کہ لیر تھوڑی بڑی ہے۔

اس نے اپنے حساب سے لیر کو قطر کے برابر ناپ کر ہاتھوں کی دو دو انگلیوں کے درمیان مضبوطی سے پکڑا اور بڑے اطمینان اور احتیاط سے فالتو کپڑے کو پھاڑ کر زمین پر پھینک دیا۔ پھر اس نے لیر سے دوبارہ چاند کے قطر کو ناپا تو پتہ چلا کہ وہ لیر زیادہ چھوٹی ہو گئی ہے اس نے مایوس ہو کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ہاتھ کی لیر کو لیروں کے ڈھیر پر پھینکا اور پھر بڑے اطمینان سے اپنے کرتے کے دامن سے ایک لیر پھاڑ لی

www.taemeernews.com

اور اسی طرح چاند کا قطر ناپنے میں مصروف ہو گیا۔

رات کے اس پہلے پہر میں ارد گرد بسنے والے بہت سے لوگ جو اپنے چراغوں سے اپنے گھروں کے اندھیروں کو پوری طرح مٹا نہیں پاتے تھے۔ چاندنی راتوں میں تھوڑی دیر کے لئے اس پارک میں چہل قدمی کے لئے آجاتے تھے۔ جیسے وہ تھوڑی بہت چاندنی اپنی جیبوں میں بھر کر گھر لے جانا چاہتے ہوں تاکہ ان کے گھر جگمگا سکیں۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو پاتا تھا۔

اس وقت ان میں سے کچھ لوگ اس پاگل کے گرد کھڑے اس کی حرکتوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ اس پاگل کی حرکتوں کو دیکھتے ہوئے وہ یہ بھول رہے تھے کہ جس طرح یہ پاگل چاند کا قطر نہیں ناپ پا رہا ہے اسی طرح ان کی بھی تمام خواہشیں اس پاگل کی پھٹی ہوئی لیروں کی طرح ڈھیر ہو چکی ہیں۔ اور وہ اپنی جیبوں میں اتنی چاندنی بھی بھر کر نہیں لے جا سکیں گے کہ وہ زندگی کے اندھیروں میں کھوئے ہوئے اپنے بچوں کی شکلیں بھی چاندنی کی روشنی میں واضح طور پر دیکھ سکیں۔

ان میں فدا علی صدیقی ہے۔ جس نے ہوش سنبھالنے سے لے کر اپنی چالیس سال کی عمر تک لگن محنت اور ایمانداری سے کام کیا ہے اور نتیجے کے طور پر وہ اب اس قدر بوڑھا ہو گیا ہے کہ لگتا ہے کہ ساری عمر وہ روزی کمانے کے بجائے چہرے کی جھریاں اور پکے ہوئے

www.taemeernews.com

بال ہی کماتا رہا ہے۔ ان میں ویرو کھڑی ہے جو جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی ایک لڑکا جوان ہوا تو پہلی تنخواہ لانے کے بعد ہی ڈوب کر مر گیا اور دوسرا لڑکا جوان ہوا تو تفصیل میں جانے سے کیا فائدہ۔ اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ اس کے گھر کی باہری دیوار کی دراڑ اب اور چوڑی ہوگئی ہے۔ وہ دیوار کو گرنے سے بچانے کے لئے اکثر اس میں ٹہنی کے تودے لگاتی رہتی ہے۔ لیکن یہ دراڑ مٹ ہی نہیں پاتی۔

انہی لوگوں میں گرہ کٹ بشیر بھی ہے۔ اگر کوئی اچھی جیب کاٹ لی اور پولیس کے شکنجے سے بچ گیا تب تو اس کے ہاں چار چھ روز چولھے سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے نہیں تو دنوں کا دھواں گھر کی چار دیواری میں ہی چکر کاٹتا رہتا ہے۔

پارک کے جس کونے میں یہ لوگ اس پاگل کے گرد کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں اس کے ساتھ ہی جنگلے کے اس پار ایک اسمگلر اپنے بیٹے کو انگلی لگائے جا رہا ہے۔ بیٹا چاہتا ہے کہ وہ بھی تھوڑی دیر رک کر یہ تماشہ دیکھے لیکن باپ کو گھر جا کر کالے روپے کو سفید بنانے کے لئے رات گئے تک کام کرنا ہے۔ اس لئے وہ بیٹے کو کہتا ہے "اچھے بچے آوارہ لوگوں کی طرح وقت نہیں ضائع کیا کرتے" اور وہ بچہ کولے کر جلدی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

پاگل اسی طرح مصروف ہے۔ بڑی لگن۔ بڑی محنت اور بڑی ایمانداری سے چاند کا قطر ناپنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہر مرتبہ لیر چھوٹی

www.taemeernews.com

پڑجاتی ہے اور اسے پھر اپنے دامن سے ایک لیر پھاڑنی پڑتی ہے۔
اس کا سارا کرتا لیر لیر ہو کر سامنے ڈھیر ہو رہا ہے۔ جیسے جیسے اسکا جسم ننگا ہوتا جاتا ہے۔ تیسے تیسے اس کی الجھن بڑھتی جاتی ہے۔ چاند کا قطر ناپ میں نہیں آ رہا۔ اور لیریں پھٹ پھٹ کر سامنے ڈھیر ہوتی جاتی ہیں۔
یہاں تک کہ وہ الف ننگا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ کی آخری لیر بھی چاند کے قطر سے چھوٹی پڑ گئی۔ اور اس نے حسرت بھری نظر سے چاند کی طرف دیکھا اور پھر لیر کو ٹوٹے ہوئے دل سے لیروں کے ڈھیر پہ پھینک دیا۔
جیسے ہی اس کے ہاتھ خالی ہوئے۔ ذہن کی توجہ ہٹی، تبھی اسے پھر احساس ہوا کہ اسے بے حد بھوک لگی ہے۔ اگر اس نے روٹی کھانے میں ذرا بھی دیر کی تو بھوک کے مارے اس کا دم نکل جائے گا
اس لئے وہ زور سے چلایا "روٹی۔ لوگو! میں بھوکا ہوں۔ میں بھوکا ہوں"
اس نے یہ کہتے ہوئے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن وہاں کون تھا سب لوگ کب کے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ چاروں طرف رات کا گھرانا ٹا تھا
اس کی آواز سناٹے میں چکر کاٹ کر واپس اس کے پاس آ گئی۔
اس کی آواز کی لیر بھی اتنی چھوٹی پڑ گئی تھی کہ وہ روٹی کے قطر کو ناپ نہیں سکی تھی۔

www.taemeernews.com

پُرانی مٹی

زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی ذرا سی لڑکھڑائی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ملک کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ بظاہر زمین جڑی ہوئی تھی لیکن دونوں ٹکڑوں نے ایک دوسرے کی مخالف سمت الگ الگ محوروں پر گھومنا شروع کر دیا۔ اور اس ایک لمحے میں لاکھوں لوگ اِدھر سے اُدھر گر پڑے اور اُدھر سے اِدھر۔

اس افراتفری میں جب میں نے ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ چودھری ماکھے خاں اور چودھری نبو سے بچھڑ چکا تھا۔ چودھری ماکھے خاں اور نبو تھے تو سگے بھائی لیکن آپس میں اینٹ بٹے کا بیر تھا۔ اور اس بیر کو نبھانے کے لیے یہ بھی ضروری سمجھتے تھے کہ ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔

شوق بھی ان کے ایک سے تھے۔ دونوں بھائی پاشا یعنی چوسر کے رسیا تھے۔ لیکن ہوتے یہاں بھی ایک دوسرے کے مخالف ہی۔ اور سارا دن

www.taemeernews.com

اس کوشش میں رہتے کہ ایک دوسرے کو ایسی مات دیں کہ دوبارہ صورت دکھانے کے قابل نہ رہے۔ اس بیچ ایک دوسرے کو ایسی ایسی گالیاں دیتے کہ آدمی تو کیا شیطان بھی شرما جائے۔

دونوں ایک دوسرے کو اس قدر پھٹکارتے تھے کہ بقول مولوی برکت علی دونوں کی گالیاں ایک دوسرے کے چہرے پر جھریوں کی شکل میں ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔

صبح نو، دس بجے ہی جب کمہار فتح محمد برتنوں کے جھنڈ کے نیچے بوریا بچھا دیتا تو نبو اور ماکھے خاں ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے یوں برتنوں کے نیچے آتے جیسے دو پہلوان دنگل میں اترتے ہوئے دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں: "اتنا تنا کیوں ہے؟ ابھی تھوڑی دیر میں تیری اکڑ دیکھوں نکال دوں گا۔"

کھیل شروع ہوتے ہی ماہر کھلاڑی کی طرح کوڑیاں پھینکتے ہوئے ماکھے خاں کہتا: "دیکھو کوڑیاں یوں پھینکی جاتی ہیں۔ یہ پڑی پچیس" اور نبو تڑاک سے کہتا: "چمگادڑ کی طرح آنکھیں کیا جھپک رہا ہے۔ پچیس نہیں خاک۔ دوانے ہیں۔ جلدی سے چل اور اگر آدمی کی اولاد ہو تو کوڑیوں کو ہاتھ نہ لگانا۔ دیکھ یوں پڑتی ہے۔ آٹھ۔ اور یہ پڑی دوسری"

"ایک آٹھ پڑ گئی تو ہینکڑی دکھا رہا ہے۔ ایسے ہی خوش قسمت ہوتے تو شادی نہ ہو جاتی....."

ہاں۔ میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ شادی دونوں بھائیوں میں سے

www.taemeernews.com

کسی کی نہیں ہوئی تھی۔ اور ایک تیسرا بھائی دین محمد بھی اب چالیس کے پیٹے میں کنورا ہی پہونچ رہا تھا۔

دونوں کی شادی کیوں نہ ہو پائی۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ ہاں اتنا پتہ ہے کہ سردیوں کی رات میں جب گلی کے موڑ والا الاؤ ٹھنڈا ہونے لگتا تھا تو کوئی منچلا ان دونوں بھائیوں کو جلانے کے لئے کہتا۔

"ایس تے گھر چلے۔ دو ہٹی نے بستر گرم کر رکھا ہوگا۔"

اس قسم کا فقرہ سن کر دونوں بھائی اندھیرے میں ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے اور پھر کسی نہ کسی بہانے ایک دوسرے کو اس دن کی آخری گالی دے کر پیچھے اپنے گھر کی طرف چل دیتے۔

ایسے ہی ایک روز جب اکھے خاں کو پائنے کی کوڑیوں سے ایک ساتھ ایک پنیتس دو گیارہ اور چار دانے پڑے اور اسے کوئی عمدہ چال نہیں سوجھ رہی تھی تو وہ حسب عادت کھوپڑی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے گہری سوچ میں غرق تھا۔

چال میں دیر ہوتی دیکھ کر نبو کوتاہ آگیا اور بولا "کیا الو کی طرح آنکھیں گھما رہا ہے۔ جلدی سے چال چل۔"

اکھے خاں اس وقت اپنی چال سوچنے میں غرق تھا۔ اس لئے الو بن جانا گوارا کر لیا۔ اور اپنی چال کے بارے میں متواتر سوچتا رہا۔ کچھ سوچ کر اس نے چال چلنے کے لئے کھوپڑی سے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ جھیورکرم چند نے اپنے سر پہ کھڑے دین محمد کی طرف دیکھا اور بولا ــــ

www.taemeernews.com

"دین محمد' اب تو تیرے بال بھی کنپٹی پر سفید ہونے لگے ہیں۔ اب بھی شادی کرے نہیں تو اپنے بڑے بھائیوں کی طرح کنورا ہی رہ جائے گا۔"

کرم چند کا چھوٹے بھائی کو شادی کر لینے کا مشورہ بھی گویا چوسر کی چال تھی جس پر غور کرنا ضروری تھا۔ اس لئے ماکھے خاں نے چال چلنے کے لئے جس گوٹ کو جہاں سے اٹھایا تھا وہیں رکھ دیا اور پھر سے کھوپڑی پر اسی طرح ہاتھ رکھ کر سوچ میں ڈوب گیا۔

ایسی حرکت پر اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو نبو ماکھے خاں کو ایسی ایسی گالیاں دیتا کہ اتفاق سے گزرتی ہوئی سراجاں دائی اپنے کولھے پر دونوں ہاتھ ٹکا کر کھڑی ہو جاتی اور اونچی آواز میں کہتی "لے خصماں نوں کھانیاں نبو۔ زبان سے بھلا برا بولنے سے پہلے یہ تو دیکھ لیا کر کہ گلی سے عورتیں بھی گزر رہی ہیں۔" اور اس طرح نبو کو گالیاں دینے سے روکنے کے لئے وہ خود ایسی ایسی گالیاں دیتی کہ نزدیک کے مکانوں والی لڑکیاں، عورتیں۔ اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتیں کہ یہ کفر کیوں سنیں۔

لیکن اس وقت نبو بھی خاموش ہی رہا اور چور نظروں سے چھوٹے بھائی دین محمد کی طرف یوں دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو۔ دین محمد بھائی تیری شادی نہ ہو پانے کے لئے میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ یہ حرامزادے ماکھے خاں کی ہی حماقت ہے جو تو ابھی تک کنوارا بیٹھا ہے۔"

اس روز کے بعد دونوں بھائی ماکھے خاں اور نبو کب تک سر جوڑے بیٹھے رہے یہ کسی کو نہیں معلوم۔ ان میں کیا بات چیت ہوئی۔ کسی نے نہیں سنی

www.taemeernews.com

دین محمد نے بھی نہیں۔ اس کو بھی تو اسی دن پتہ چلا جب ماکھے خاں اور
نبو اجلا کرتا اور تہمد باندھے، سروں پر کلف دار پگڑی لگائے ایک دوسرے
سے اس بات پر گالی گلوچ کر رہے تھے کہ دین محمد کی بارات میں کس کو
لے جایا جائے اور کس کو نہیں ؟

ماکھے خاں کہہ رہا تھا "لڑکی والے غریب ہیں۔ ان پر زیادہ بڑی بارات
کا بوجھ ڈالنا ٹھیک نہیں۔

نبو کا کہنا تھا" ہمارے خاندان میں کوئی ستر برس بعد شادی ہونے
جارہی ہے۔ پوری شان سے ہونی چاہیئے۔ بارات ایسی نکلے کہ تیرے
باپ کی بارات بھی لوگ بھول جائیں ۔"

"حرامی کی اولاد کیا تو باپ کی بارات میں باراتی بن کر گیا تھا۔"

غرض کہ دین محمد کی بارات گئی اور دھوم دھام سے گئی۔ لیکن اس طرح
سے کہ جیسے ایک دولہا اور دو باراتیں ہوں۔ دونوں بھائیوں میں جب کوئی
جب کوئی سمجھوتہ نہ ہو پایا تو ہر ایک نے اپنے اپنے باراتی الگ الگ اکٹھے
کئے اور دولہا کے آگے پیچھے دلہن کے یہاں پہونچے۔

دلہن بیاہ کر جب گھر آگئی تب بھی دونوں بھائیوں کی لڑائی میں کوئی
کمی نہ ہوئی۔ ہاں البتہ یہ دیکھا گیا کہ جب ایک بھائی دوسرے کی گالیوں سے
بچنا چاہتا تو بھاگ کر گھر کی چہار دیواری میں پناہ لیتا۔ کیونکہ اسے معلوم
تھا کہ دوسرا بھائی گھر کے اندر آنے والی نظروں سے تو دیکھ سکتا
ہے لیکن گالی نہیں دے سکتا۔

www.taemeernews.com

لیکن ایسا نہیں تھا کہ گھر کے اندر دونوں کی لڑائی ہوتی ہی نہیں تھی۔ اگر غلطی سے ماکھے خاں کی نظر دلمن کی طرف اٹھ جاتی تو نبو اس کی کمر میں ٹھوکر مارتے ہوئے اس کو گھر سے دفع ہو جانے کے لئے کہتا۔ اور اگر نبو کی نظر دلمن کی طرف اٹھ جاتی تو ماکھے خاں پاؤں سے جوتی اتار کر زمین پر دو چار مرتبہ یوں مارتا جیسے کہنا چاہتا ہو کہ "حرامی کی اولاد اس بری حرکت سے باز آجا نہیں تو اسی جوتے سے تیری کھوپڑی لال کر دوں گا"۔

اب تک یہ لڑائی دلمن سے چھپی ہوئی تھی۔ حالانکہ دین محمد نے بڑے بھائیوں کے متعلق اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ لیکن جب دلمن کے ایک پھول سی لڑکی پیدا ہوئی تو بھائیوں کی لڑائی برتنوں کے جھنڈ سے دبے پاؤں چلتے ہوئے گھر کی چار دیواری میں ایسی گھسی کہ گھر میدان جنگ بن گیا۔

پہلے تو جھگڑا ہوا نام پر۔ بے چارے دین محمد یا لڑکی کی ماں کی تو کوئی سنتا ہی نہ تھا۔ ماکھے خاں کہتا "لڑکی کا نام ہوگا روشن آرا" اور نبو کہتا تھا "ہم تو اپنی بچی کا نام خدیجہ رکھیں گے۔ اور جب کوئی فیصلہ نہ ہو پایا تو دونوں نے اسے اپنے اپنے ناموں سے پکارنا شروع کیا۔ لیکن پھر بھی روز ہی ننھی لڑکی کو گود میں لینے پر ایسا جھگڑا ہوتا کہ مارے ہنسی کے دلمن کے پیٹ میں درد ہونے لگتا۔

اور ننھی سی جان کو اس چھینا جھپٹی میں روتے دیکھ کر تو دونوں بھائی جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے اور ایک دوسرے کو ایسی گندی گندی گالیاں دیتے کہ دلمن بے چاری کو سارے شرم کے پچھلی کوٹھری میں پناہ لینی پڑتی۔

www.taemeernews.com

ایسے میں بوڑھی سراجان دائی وہاں آکر لڑکی کو دونوں سے چھین کر دلہن تک پہنچاتی اور یہ دونوں آپس میں لڑتے جھگڑتے برتنوں کے جھنڈ کی طرف چل پڑتے رات کے وقت یہ لڑائی اور طول پکڑتی۔ نبو اور ماکھے خاں دونوں میں ہر ایک چاہتا کہ لڑکی کو وہ ساتھ لے کر سوئے۔ یہ کھینچا تانی اتنی بڑھتی کہ کبھی کبھی سراجاں دائی کو اپنے گھر سے زور سے چلا کر کہنا پڑتا کہ "مردو قبر میں پڑ کر سو بھی جاؤ کہ دنیا کو آرام ملے"۔

لیکن یہ بات تو بہت پرانی ہے۔ ماکھے خاں اور نبو کب کے مر کھپ چکے ہوں گے یا اور بات ہے کہ جس زمین پر میں ہوں وہاں ماکھے خاں اور نبو کی قبریں نہیں ہیں اور جہاں ان کی قبریں ہیں وہاں میں نہیں جا سکتا۔ لیکن اگر اتفاق سے میں وہاں پھر جا سکوں تو رات کو دونوں کے بھوت اپنی اپنی قبروں میں لیٹے ایک دوسرے سے جھگڑتے ہوئے ضرور ملیں گے اور اگر میں نے آگے بڑھ کر پہلے ماکھے خاں کو سلام کیا تو پیشتر اس کے کہ وہ جواب دے نبو بول پڑے گا: "ارے بہرے کی اولاد سنتا نہیں کہ کوئی پردیسی تجھے سلام کر رہا ہے۔ جواب کیوں نہیں دیتا"۔

اور پھر جواب میں ماکھے خاں قبر سے گردن نکال کر کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتا ہوا کہے گا: "نبو تو مرنے کے بعد بھی اندھے کا اندھا ہی رہا۔ اپنے پرتاپ سنگھ کے لڑکے کو تو پردیسی کہہ رہا ہے۔ وہ تو ہے ہی اسی مٹی کی پیداوار وہ بھلا پردیسی کیسے ہو گیا"۔

---

www.taemeernews.com

سُورج کا مہمان

میں اپنے کرائے کے مکان کے آنگن میں بیٹھا زندگی کی فکروں میں غرق تھا۔ بچے ٹھیک سے نہیں پڑھ رہے۔ اُن کے مستقبل کا کیا ہوگا؟ آمدنی کم ہے۔ اخراجات زیادہ قرض بڑھتا جا رہا ہے۔ اس جھمیلے سے کب جان چھوٹے گی؟ مالک مکان نے مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ اگر مقدمہ ہار گیا تو کیا ایک مرتبہ پھر رفیوجی بننا پڑے گا؟

انہی فکروں میں ڈوبا ہوا تھا کہ سورج کی کچھ کرنیں زریں کپڑے پہنے قطار در قطار میرے سامنے دست بستہ کھڑی ہو گئیں اُن میں سے ایک جو غالباً سب سے نازک اندام اور خوبصورت تھی، جھک کر تعظیم بجا لائی اور بولی: "آپ کو سورج نے بلایا ہے۔ ہم آپ کو ساتھ لے چلنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اُوپر آسمان کی طرف دیکھا، جہاں سورج پوری آب و تاب کے ساتھ دمک رہا تھا اور میری طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "ہاں۔ ہاں میں نے ہی بُلا بھیجا ہے۔ فوراً آؤ۔"

www.taemeernews.com

"اور جائیں گے کیسے؟" مجھے کچھ اور سمجھ نہیں آیا تو یونہی ایک سوال کر دیا
بس آپ کے حکم کی دیر ہے۔ پلک جھپکنے میں ہم آپ کو پہنچا دیں گے
ہم سب سے تیز رفتار کرنیں ہیں۔

اُس وقت میری بیوی رسوئی گھر میں میتھی کی سبزی بھون رہی تھی
دہی اس نے رات کو جما دیا تھا۔ لسی اور مکھن کا پروگرام بھی تھا جو بہت
دنوں بعد نصیب ہونے جا رہا تھا۔ اور میتھی کے بھونے جانے کی خوشبو
بھی میرے مشام میں آ رہی تھی۔ اس لئے میں نے کرنوں سے کچھ کہے بغیر
بیوی کو آواز دی "کھانا کب تک بن جائے گا؟" بیوی نے پتہ نہیں سٹوو
کے شور میں میری آواز سنی یا نہیں سنی۔ لیکن وہی کرن بول اٹھی۔
کھانا وغیرہ لوٹ کر کھائیے گا۔ آنے جانے میں کوئی زیادہ وقت تھوڑے
لگے گا۔ بس جانا اور واپس آ جانا ہے۔"

میں اٹھ کر یوں کھڑا ہو گیا۔ جیسے بندھا ہوا آدمی کھڑا ہوتا ہے۔
اور بیوی سے مسکراتے ہوئے بولا: "اور لوگ تو مدراس اور امریکا کے دورے
پر جاتے ہیں دیکھو اپنا دورہ آسمان کا نکل آیا ہے۔ اُوپر سورج نے بلایا
ہے۔ یہ کرنیں مجھے لینے آئی ہیں۔"

بیوی نے میتھی بھونتے ہوئے کہا: "آپ بڑا تبر ماریں گے تو عالم باغ
سے امین آباد تک ہو آئیں گے یا زیادہ سے زیادہ حضرت گنج تک۔
آپ کی بات کا یقین مجھے نہیں آتا۔"

میں نے کہا: "قدرت نے پہلی دفعہ سنی ہے۔ اتنی بڑی ہستی جس کے

www.taemeernews.com

وجود سے ساری دنیا قائم ہے۔ اس نے بلایا ہے اور تمہیں یقین ہی نہیں آرہا۔ ایسا کفر نہیں بولا کرتے۔"

وہ بولی "میری طرف سے دوستوں کے پاس جاؤ یا سورج کے پاس میرے دکھوں کا مداوا ڈھونڈھ کر لاؤ تو جانوں میرے لئے گھر کی چھوٹی چھوٹی فکریں ہی جان لیوا ہوتی جا رہی ہیں۔ اور آپ کو میں جب بھی ان کی یاد دلاتی ہوں تو آپ یونہی بے پر کی اڑانے لگتے ہیں"

ایک کرن بولی: جلدی کیجئے دیر ہو رہی ہے۔"

"اچھا تو میں چلا" میں نے بیوی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"اور یہ میتھی..... کھانا کھا کر تو جاؤ"

جب میں کرنوں کے بُنے نرم و نازک اور رنگین غالیچے پر سوار آسمان کی طرف اڑا جا رہا تھا تو میتھی کی خوشبو اور بیوی کی کھنکھناتی آواز بہت دور تک میرے تصور میں بسی رہی تھی۔

کرنوں نے مجھے ایک نہایت چمکدار اور خوبصورت ستارے پر جا کر اُتارا۔ بہت ہی خوشگوار ماحول تھا۔ عجیب و غریب طرح کی زمین۔ نئے قسم کے پہاڑ۔ چمکتے دمکتے موتی چاروں طرف یوں بکھرے پڑے تھے جیسے زمین پر مٹی کے ذرے کوئی پہاڑ چاندی کا معلوم ہوتا تو کوئی سونے کا۔ آنکھوں کو جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا دیکھ رہی ہیں۔ تبھی دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس ستارے کی طرح اور ستارے بھی دیکھنے کو ملیں تو کیا خوب ہو۔ قبل اس کے کہ حرف مدعا دل سے زبان تک آئے۔ رنگ برنگی کپڑوں میں

www.taemeernews.com

ملبوس ایک کرن نے جھک کر سلام کیا اور بڑی عاجزی سے بولی: "اب آسمان پر آئے ہیں تو کیا آپ دوسرے ستارے بھی دیکھنا پسند کریں گے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو دوسرے لمحے کرنوں کے اُسی گروہ کے ساتھ میں دوسرے ستاروں کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ آن کی آن میں انھوں نے مجھے لاکھوں ستارے کروڑوں سیارے اور انگنت چاندوں کی سیر کرائی۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں ایک بچے کی طرح کودتا پھاندتا ایک قدم ایک ستارے پر رکھ رہا ہوں۔ تو دوسرا دوسرے ستارے پر۔

اس دوران وہ تمام کرنیں باندیوں کی طرح ہاتھ جوڑے میرے ہر حکم کی تعمیل کر رہی تھیں۔ شاید میں غلط کہہ گیا۔ حکم کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ ہوتا یہ رہا تھا کہ اِدھر دل میں خواہش پیدا ہوئی اور فوراً پوری ہو گئی۔

جب میں سب دیکھ چکا تو سورج سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

سورج بولا: "ابھی میں نے دیکھا۔ تم بہت خاموش بیٹھے تھے اپنے گھر کے آنگن میں۔"

گھر کے غموں کی بات یاد آئی تو جیسے طلسم ٹوٹا۔ اور میں آسمان پر بیٹھا ہوا جیسے زمین پر لڑھک سا گیا۔ پھر بھی میں نے سنبھل کر کہا۔

"ہاں زندگی کے غم ہیں۔ جن سے نجات نہیں مل پا رہی ہے۔"

"غم کیا ہوتا ہے؟"

میں سورج کا سوال سن کر چونکا۔ اور کہا۔ غم، غم ہوتا ہے۔ غم میں

www.taemeernews.com

ایک ایک لمحہ عمروں لمبا ہو جاتا ہے۔ اور جس کی ساری عمر ہی غموں سے بھری ہو تو اس کے دکھوں کا اندازہ لگانا آسان نہیں"۔ میں یہ بات کہتے ہوئے اپنے تمام غم سیمٹ کر چہرے پر لے آیا تاکہ سورج کو اندازہ ہو سکے کہ غم کیا ہوتا ہے۔

لیکن سورج پر جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ وہ اسی لاتعلقی سے بولا۔

"اگر یہ غم مٹ جائیں تو کیا ہوگا؟"

مجھے یکبارگی خیال آیا جیسے کرشن مہاراج سُدامہ کی غریبی پر ترس کھا کر اس کی جھونپڑی کی جگہ محل بنوا رہے ہوں۔

میں نے کہا "غم نہیں ہوں گے تو زندگی سکون سے گزرے گی"۔

"اور اگر سکون ہوگا تو کیا ہوگا؟"

اچھا لگے گا۔

"اچھا لگے گا تو کیا ہوگا؟"

اس کا جواب مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ اس لئے کہہ دیا "بس یہی کہ اچھا لگے گا"۔

اس کا مطلب ہے کہ تمہارے نزدیک زندگی کا مقصد بس اُس سکون کو حاصل کرنا ہے جس میں دُکھ نہ ہوں۔

میں نے کہا۔ یہ تو دنیا کا ہر آدمی چاہتا ہے۔

اور دنیا کا ہر آدمی اسی لئے دکھی رہتا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دکھ تمہیں اچھا نہیں لگتا اور پھر بھی سکون حاصل کرنے کے لئے

www.taemeernews.com

دکھی ہو رہے ہو، کیا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سکون سب سے بڑا دکھ ہے اور تم گھر کے آنگن میں تھوڑی دیر پہلے بیٹھے اسی سکون کو حاصل کرنے کے لئے دکھی ہو رہے تھے۔

گھر کے آنگن کا ذکر آتے ہی خیال آیا کہ بیوی کھانا بنا کر انتظار کر رہی ہوگی۔ اس کے علاوہ میں یہ جان کر بھی دکھی ہو رہا تھا کہ سکھ کا دوسرا نام دکھ ہے۔

مجھ سے کچھ اور کہتے نہ بنا تو میں نے کہا: "پھر کسی وقت باریابی کا موقع دیں تو اطمینان سے آکر بات کروں گا۔ اس وقت تو بھوک لگ رہی ہے اور میتھی بھی بھن کر تیار ہو گئی ہوگی۔ لسّی اور مکھن بھی ہوگا۔ میں جانا چاہتا ہوں۔"

دوسرے ہی لمحے کرنوں کے جگمگٹ میں گھرا میں زمین کی طرف پرواز کر رہا تھا۔

جب کرنوں نے مجھے اُتارا تو میں نے دیکھا کہ جہاں میں اتارا گیا ہوں وہ میرے گھر کا آنگن نہیں ہے۔ وہ تو کوئی اجنبی سا پارک تھا۔

کرنوں سے میں نے کہا: "مجھے میرے گھر پر چھوڑیئے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

وہ بولیں: "ہم آپ کو اسی جگہ سے لے گئے تھے۔"

"یہ تو پارک ہے۔ آپ لوگ مجھے میرے گھر سے لے گئی تھیں، وہاں میری بیوی رسوئی گھر میں میتھی بھون رہی تھی۔

www.taemeernews.com

کرنیں اصرار کر رہی تھیں کہ وہ دھوکا نہیں کھا سکتیں تھوڑی دیر پہلے وہ اسی جگہ سے مجھے اٹھا کر لے گئی تھیں۔

ہماری بات چیت سن کر کچھ اجنبی لوگ بھی ہمارے گرد اکٹھے ہو گئے۔ میں نے کہا۔ اگر اسی جگہ سے آپ لوگ مجھے لے گئی تھیں تو میرا گھر کہاں ہے؟

ہمارے گرد جو لوگ اکٹھا ہو گئے تھے ان میں سے ایک نے میرے گرد طواف کرتی ہوئی کرنوں سے پوچھا۔ اس آدمی کا نام کیا ہے؟

میں نے اپنا نام بتایا اور پوچھا: "کیا تم بتا سکتے ہو کہ میرا گھر کہاں ہے؟"

اس طرح کے نام کا آدمی تو سارے شہر میں نہیں ہے

"یہ نام ہی کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔"

"واہ! مجھے۔ غصہ آ گیا۔"

"آپ یہاں کب رہتے تھے؟" کسی نے پوچھا۔

کب؟ آج صبح تک رہتا تھا۔ جب میں گیا تھا۔ اُس وقت میری بیوی میتھی بھون رہی تھی۔ اب تو میتھی بھن چکی ہوگی۔ اور میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔

اتنے میں کچھ اور لوگ بھی اکٹھا ہو گئے تھے۔ اگر وہ میرا ہی شہر تھا اور میرا ہی گھر جیسا کہ کرنیں بار بار کہہ رہی تھیں تو میں وہاں اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گیا تھا۔ اپنے ہی گھر میں کسی کے نہ پہچانے جانے پر میں بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ خاص طور پر اُن کرنوں کے سامنے جو ابھی تک ہاتھ باندھے میرے حضور میں کھڑی تھیں۔ میرے ہر حکم کی تعمیل کرنے کے لئے۔

www.taemeernews.com

تبھی اُس اجنبی بھیڑ کو چیرتی ہوئی ایک خوبصورت سی عورت میرے سامنے آئی۔ اُس نے مجھے میرے نام سے پکارا۔

مجھے خوشی ہوئی کہ آخر مجھے کسی نے پہچان لیا۔"

جب آپ گئے تھے تو کیا آپ کی بیوی رسوئی میں میتھی کی سبزی پکا رہی تھیں؟"

ہاں۔ ہاں۔ میں نے بے صبری سے کہا۔" مجھے اس کے پاس فوراً لے چلو مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" اب مجھے یہ خیال آیا کہ سورج نے واقعی مجھ پر کرشن کی طرح مہربان ہو کر میرے گھر کا نقشہ بدل دیا ہے۔

اس عورت نے آگے بڑھ کر میرا بازو تھام لیا۔

مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے فخر سے سورج کی کرنوں کی طرف دیکھا اور ان سے کہا۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔ یہ عورت مجھے میرے گھر پہنچا دے گی۔"

وہ عورت مجھے ساتھ لے کر چلتے ہوئے بولی:۔ میں پچھلے دو ہزار سال سے آپ کو ڈھونڈھ رہی ہوں۔ دو ہزار سال پہلے پرماتما کے حکم سے میں تمھیں لینے آئی تھی۔ لیکن تمھاری بیوی جو اس وقت رسوئی گھر میں میتھی بھون رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ ابھی ابھی تم کہیں چلے گئے ہو۔ تب سے میں پریشان تھی۔ تمھارے وقتوں کے سبھی آدمی وہاں پہنچ چکے ہیں۔ اکیلے تم ہی غائب تھے۔"

دو ہزار سال کی بات سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اور اب اس عورت کے ساتھ جاتے جاتے پھر مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ میری زندگی کے اُن

www.taemeernews.com

غموں اُن دکھوں کا کیا ہوا ہوگا۔ اور وہاں پہنچنے پر میری بیوی رسوئی گھر میں میٹھی بھونتی ہوئی ملے گی یا نہیں۔

لیکن کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ وہ خوبصورت عورت بڑی تیزی سے، اس دنیا سے باہر مجھے انجانی سمت کی طرف لئے جا رہی تھی۔

اور دکھ اور سکھ اور بھوک اور دوسرے محسوسات نہایت غیر اہم سے محسوس ہو رہے تھے۔

---

www.taemeernews.com

میلی گٹھری کا بوجھ

اس کے بوڑھے چہرے کی جھریاں مہنجو دارو کے پتھروں پر کندہ ان تحریروں سے ملتی جلتی ہیں۔ جن کے حروف کی ابھی تک کوئی واضح پہچان نہیں ہو سکی اور ان جھریوں کے نقش آثار قدیمہ کی کھدائیوں کی طرح اس قدر بے ترتیب اور گہرے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس بوڑھے کے چہرے پر بہت سی دراڑیں پڑ گئی ہوں اور ہر لمحہ یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ یہ شکستہ عمارت اب ٹوٹی کہ اب ٹوٹی۔ اس کی پریشانی یہ ہے کہ وہ بوڑھا ہر وقت اپنے لاغر جسم پر ایک میلی کچیلی بڑی سی گٹھری اٹھائے رہتا ہے۔ جس کے بوجھ کی وجہ سے اس کی بوڑھی کمر دُھری ہوئی رہتی ہے اور اس کے لئے ایک ایک قدم اٹھانا صدیوں کے فاصلے کو پاٹنے والی بات ہوتی ہے۔

اتنا بوجھ اپنے جسم پر لادے اگر وہ کہیں ایک جگہ کھڑا ہو جائے تب بھی کوئی بات نہیں لیکن اسے تو اس ملک کا کاؤں گاؤں گھاٹ

www.taemeernews.com

گھاٹ گھومنے کی لت پڑی ہے۔ زندگی کے اس سفر پر چلتے چلتے اسکے ننگے پاؤں کی ایڑیوں میں بڑی بڑی بیائیاں پھوٹ آئی ہیں جن سے ہر وقت لہو رستا رہتا ہے اور اس کے بوڑھے وجود پر یگوں کی گرد و غبار اس قدر جم گئی ہے کہ قریب سے دیکھنے پر بھی اس کی زندگی کے اصلی نقش نظروں سے اوجھل ہی رہتے ہیں۔

اس شام وہ ہماری گلی میں اس وقت نمودار ہوا جب محلے میں ایک بارات آنے والی تھی۔ ہماری گلی باہری سڑک تک روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ ہر ایک نظر بار بار بارات کے انتظار میں گلی کے اُس سرے کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ اس لئے جیسے ہی وہ بوڑھا اپنی جھکی ہوئی کمر لئے اور سر پر بھاری سی گٹھری اٹھائے نمودار ہوا۔ لڑکیوں کے جھنڈ میں ایک زوردار قہقہہ ابھرا "لو بھائی۔ دولہا میاں تو آگئے بارات کہاں رہ گئی"؟ تبھی ہم سب نے اسے دیکھا۔

وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا جتنا قریب آتا گیا اتنا ہی ہنسی خیز بنتا گیا۔ اس کے جھکے ہوئے وجود پر ٹکی گٹھری کو دیکھ کر ایسا گمان ہوتا تھا جیسے وہ ایک سوال کی صورت سب کے پاس آرہا ہو۔ سب جاننا چاہتے تھے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیوں آیا ہے؟ کس کے پاس آیا ہے؟ اور نہ معلوم کتنے سوال لوگوں کے ذہنوں میں اٹھ رہے تھے۔ جب وہ اور قریب آیا تو اس کی گٹھری کے اوپر باہر کی جانب الگ سے بندھے ہوئے اس کے پرانے طرز کے جوتے کو دیکھ کر لڑکوں

www.taemeernews.com

کی ٹولی میں سے کسی نے کہا۔ "بابا پاؤں بھی گٹھری میں باندھ کر رکھ لو۔"
اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا تو۔ انہی میں سے ایک لڑکے نے فقرہ کسا
"بابا خود بھی گٹھری میں بندھ کر بیٹھ جاؤ۔" اتنا بوجھ اٹھائے کیوں
پریشان ہو رہے ہو؟"

"بابا گٹھری میں بندھ کر بیٹھ گیا تو اسے اٹھائے گا کون؟" ان میں
سے کسی نے سوال کر دیا۔

"مجھے جس دن یہ گٹھری اٹھانے کو ملی۔ میں اسے دریا میں پھینک
آؤں گا۔"

"دریا میں پھینکنے کے لئے بھی تو تمہیں اس گٹھری کو سر پر اٹھانا ہوگا"
"اور سر پر اٹھاتے ہی تمہاری کمر دہری ہو جائے گی۔"
"اور تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔"
"چہرے پر جھریوں کا جال پڑ جائے گا۔"
"اور پاؤں میں بیائیاں پھوٹ پڑیں گی۔ جن سے لہو رس رہا ہوگا"

بوڑھا سب کے سامنے سے رینگتا ہوا آگے بڑھا تو ایک بزرگ
نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور لوگوں کو ہٹاتے ہوئے بوڑھے
کے لئے راستہ بنانے لگا۔ بوڑھے نے چوگان کے ایک کونے میں پہنچ کر
گٹھری کو زمین پر گرا دیا اور خود کمر سیدھی کرنے کی کوشش کرنے لگا
لیکن میلی گٹھری کے بوجھ سے جب ایک دفعہ کمر دہری ہو جائے
تو پھر یہ سیدھی نہیں ہوا کرتی۔

www.taemeernews.com

بوڑھا ہانپتا ہوا زمین پر ہی دم لینے کے لئے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی دھوتی کے پلو سے چہرے کا پسینہ پونچھا۔ اتنے میں کچھ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کوئی اس کے لئے شیشہ کے گلاس میں پانی لے آیا تو بوڑھے نے ہاتھ کے اشارے سے پانی کو دور رکھنے کے لئے اس طرح اشارہ کیا جیسے وہ پانی اسے ناپاک کر دے گا۔ لیکن پانی دیکھ کر اس کے سوکھے ہونٹوں کی پیاس جاگ آئی تھی اس لئے اپنے سوکھے ہاتھوں سے گٹھری کی گانٹھیں کھولنے لگا۔ اس میں سے ایک رسی اور لوٹا نکال کر اس نے سوالیہ نظروں سے ہم لوگوں کی طرف دیکھا جیسے پوچھنا چاہتا ہو کہ کنواں کہاں ہے؟

اس طرح اس نے ہم لوگوں کا بنا ہوا کھانا بھی نہ کھایا اور تین اینٹوں کے سہارے چولھا بنا کر کافی رات تک وہ اپنے لئے کھانا بناتا رہا جس کی سوکھی رسد ہمیں لوگوں نے دی تھی۔ رات اس نے چوگان میں اپنے چولھے کی آگ کے سہارے گزار دی۔

اگلی صبح جب بیاہ والے گھر سے ڈولی جانے لگی اس وقت ہم نے دیکھا۔ بوڑھے نے ایک کونے میں اپنے ارد گرد آٹے کی سفید لکیر زمین پر کھینچ لی تھی تاکہ کوئی اس کے اندر نہ جا سکے۔ ان لکیروں کی حدود کے اندر اس نے پانی چھڑک رکھا تھا۔ تین اینٹوں کے چولھے پر رکھا اس کا کھانا پک رہا تھا اور وہ خود بدن پر صرف ایک دھوتی باندھے کسی بوسیدہ سی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ پاس ہی رکھی ہوئی

www.taemeernews.com

اس کی میلی گٹھری میں سے اس کا خالی کشکول یوں جھانک رہا تھا جیسے صدیوں سے اس کا پیٹ خالی ہو۔ ایک طرف اس کی مالا کے منکے کسی بدرنگ تعویذ میں الجھے ہوئے تھے۔

ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ اس گٹھری میں اور کیا کچھ ہے۔ لیکن اس وقت جہیز سے بھرے ہوئے ٹرک کے پاس بینڈ بجنا شروع ہو گیا تھا۔ ادھر دلہن گھر سے باہر آ رہی تھی۔ اس لئے سب لوگ اس بوڑھے کو چھوڑ کر ڈولی کی طرف بڑھے۔ جب تک ہم لوگ ڈولی وداع کر کے آئیں، بوڑھا بھی جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سارا سامان اپنی گٹھری میں باندھ لیا تھا۔ اس کا پرانی طرز کا جوتا رات کی طرح گٹھری کے اوپر ہی الگ سے بندھا تھا۔ ہم لوگوں کو قریب آتے دیکھ کر اس نے اشارہ کیا کہ اسے گٹھری اٹھوانے میں مدد کریں۔

میں نے گٹھری اٹھوانے سے پہلے بوڑھے کے جوتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "بابا۔ یہ جوتا پہن کیوں نہیں لیتے۔ ننگے پاؤں چلتے چلتے تمہارے بیائیاں پھوٹ آئی ہیں، لہو رس رہا ہے۔"

"یہ پرانے وقتوں کی نشانی ہے۔" ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بوڑھا نہیں بلکہ پرانی صدیاں بول رہی تھیں۔ "یہ مجھے بہت عزیز ہے" یہ کہتے ہوئے۔ بوڑھے نے گٹھری پر ہاتھ رکھ دیئے۔ جیسے کہہ رہا ہو اسے اٹھوا دو۔

ہم سب نے مل کر اس گٹھری کو اٹھوانا چاہا تو وہ ہم سے اٹھوائی

www.taemeernews.com

نہیں جا رہی تھی۔

"ارے یہ تو بہت بھاری ہے۔ یہ بوڑھا اسے کیسے اٹھائے اٹھائے پھرتا ہے" کسی نے کہا۔

اتنے میں دلہن کا باپ بھی کچھ لوگوں کے ساتھ ادھر ہی آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر کسی نے کہا" یار ایک ہی لڑکی کی شادی نے بیچارے کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ بیچارا بوڑھا ہو گیا ہے"

ان پرانے رسموں رواجوں اور فضول کے خرچوں نے ہم سب کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ تبھی تو ہم سے یہ گٹھری اٹھ نہیں پا رہی"

جب ہم سب نے مل کر بدقت تمام اس گٹھری کو اس بوڑھے کے سر پہ رکھا تو ایک لڑکے نے بوڑھے کو کہا:۔

"بابا اب ہمارے گاؤں میں آؤ تو اس گٹھری کو دریا میں پھینک کر آنا۔ ہم سے دوبارہ نہیں اٹھوائی جائے گی۔ ابھی سے بتائے دیتے ہیں"

بوڑھا اپنی میلی گٹھری اٹھائے آثار قدیمہ کی صورت پھر کسی پگڈنڈی پر چل دیا تھا۔ اس کے پاؤں سے اسی طرح لہو رس رہا تھا۔

www.taemeernews.com

مُصنّف کی دوسری کتابیں

پہلی آواز (کہانیوں کا مجموعہ)
چار روپے

سفید خون (نانک سنگھ کے پنجابی ناول کا ترجمہ)
آٹھ روپے

ایک بات سنو (کہانیوں کا مجموعہ)
زیر طبع

نفس یک نفس (ناول)
زیر طبع

اندھے اندھیرے (ڈرامہ)
زیر طبع

اشلوک بابا فرید (بابا فرید کے اشلوکوں کا ترجمہ)
زیر طبع